Scanned with CamScanner

(افسانے)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Scanned with CamScanner

انتظار حسین کی یاد میں

Scanned with CamScanner

جوہر علویست در ہر جزو سفلی موجزن
سنگ ہم باآں زمیں گیری سراپا آتش است

[علوی جوہر، ہر سفلی جز میں کارفرما ہے، مادے کا آخری ذرہ تک تڑپتا ہے، اور توانائی سے لبریز ہے۔ پتھر کی رگوں میں آگ ہے، گو زمین پر پڑا ہے، پر سراپا آتش ہے۔]

مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ء۔۱۷۲۰ء)

فکشن کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ، چیزوں میں سے معنی کشید کرتا ہے، جب کہ حقیقت کا خود اپنے آپ میں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

ماخوذ: آلڈس ہکسلے (۱۸۹۴ء۔۱۹۶۳ء)

Scanned with CamScanner

فہرست

اباکا صندوق ۷

ہوسکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو ۵۳

فرشتہ نہیں آیا ۶۶

کنویں سے کٹورے تک ۸۰

لوگوفوبیا ۱۰۵

نیا حکم نامہ ۱۱۳

حکایاتِ جدید و مابعد جدید

شکر اس کا جس نے ہمیں آدمی یا سور نہیں بنایا ۱۳۱

کس کا نام؟ ۱۳۴

گھسا ہوا جوتا ۱۳۸

بے سر کا نسوانی دھڑ ۱۴۱

دلفگار نے خاموشی توڑ دی ۱۴۵

تیر کا دریا ۱۵۱

یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے تم ایک جنگل میں ہو ۱۵۳

کھنڈر کی تختی ۱۵۸

شرپسند ۱۶۰

''شکم کی بھوک سیر ہو جاتی ہے، زبان کی نہیں'' ۱۶۲

تیسرا دروازہ ۱۶۵

Scanned with CamScanner

ابا کا صندوق

اسے باپ سے وراثت میں کافی کچھ ملا۔ دوسوا ایکڑ اور کچھ کنال زمین، ایک بڑی حویلی، سیکڑوں مویشی، ڈھیر سارے طلائی زیور اور لکڑی کا بنا ہوا ایک پرانا صندوق۔ سب کچھ اس معمول کا حصہ تھا، جس کا وہ تیس برس کی عمر میں، اور خاص طور پر گزشتہ آٹھ سالوں میں عادی بنا تھا۔ بس دو باتیں معمول سے ہٹ کر تھیں۔ باپ کی موت کے بعد کا ایک واقعہ، اور پرانا صندوق۔ شروع میں وہ ان دونوں باتوں کے تعلق کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے بس ان کے خلافِ معمول ہونے کو محسوس کیا، اور خیال کیا کہ وہ جلد ہی اس زندگی کی طرف پلٹ آئے گا، جسے اس نے گزشتہ آٹھ سالوں سے اختیار کیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ ابا جان کا انتقال اور اس سے جڑا واقعہ زیادہ بڑا خلافِ معمول واقعہ ہے یا ترکے میں ملنے والا صندوق۔ فوراً ہی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے ایک قدیمی خوف کے زیر اثر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ جب اطمینان ہوا کہ وہ شام کے وقت اس بڑے کمرے میں اکیلا ہے، جہاں اس کے والد دن کا زیادہ حصہ گزارا کرتے تھے، تو اس نے دیوار پر ابا جان کی جوانی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو پہلی بار گہری توجہ سے دیکھا۔ زبردست۔ ابا جان جوانی میں بھی پگڑی باندھتے تھے، اور ہاتھ میں چھڑی رکھنے کے عادی تھے۔ دائیں جانب آئینہ تھا، جس میں سامنے کی دیوار پر ٹنگی دونالی بندوق کا عکس نظر آ رہا تھا۔ ہونہہ یہ تو اسی کمرے میں بنوائی گئی تصویر لگتی ہے۔ دائیں جانب تپائی تھی، جس پر کتابیں رکھی تھیں، کچھ کاغذ اور ایک قلم دکھائی دے رہا تھا۔ ابا جان کا ناک نقشہ چچا سے کافی ملتا ہے، سوائے لمبی قلموں کے۔ چچا کو وہ جب بھی دیکھتا تھا تو اسے عہدِ وسطیٰ کے یورپی

Scanned with CamScanner

سائنس دانوں کی لمبے بالوں اور بڑی قلموں والی تصویریں یاد آتی تھیں جنھیں اس نے پبلک سکول کے دنوں میں دیکھا تھا۔ چچا کے سر کے بال آدھے رہ گئے تھے، مگر قلمیں کافی بڑی تھیں۔ ابا جان کو بڑی قلمیں سخت ناپسند تھیں۔ ابا جان کہا کرتے تھے کہ تو اپنے نانا پر گیا ہے۔ تیرا ماتھا اور موٹی بھنویں بالکل تیری ماں کے ابا کی طرح ہیں۔ اس نے دو بار بڑی سنجیدگی سے ابا سے پوچھا تھا کہ بچوں کو بڑوں کی شکلوں سے پہچاننے کی منطق کیا ہے؟ ایک بار تو ابا نے اس بات کو توجہ نہیں دی تھی، البتہ دوسری بار کہا: اس لیے کہ بچے کو بڑے پیدا کرتے ہیں۔ بچے کی شکل ہی میں نہیں، اس کے خون، اس کے دماغ، اس کے خیالات میں بھی بڑے موجود ہوتے ہیں، جیسے درخت کی ہر شاخ تنے سے جڑی ہوتی ہے۔ لیکن ابا شاخ تو درخت سے ہر وقت جڑی رہتی ہے، مگر بچے بڑے ہوتے ہیں، اور خدا جانے کہاں کہاں کی مٹی، نمک، ہوا ان کے جسم اور خون میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی دلیل پر ابا تھوڑی دیر چپ ہوئے اور پھر آہستہ سے بولے، ہر بچے میں اس کے باپ دادا درخت کی طرح ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بچہ صرف ان کا انکار کرتا ہے، مگر انکار سے سچائی تھوڑا تبدیل ہوتی ہے۔ یہ باتیں سوچتے ہی اس کی آنکھ میں نمی آ گئی.....لیکن.....مٹی.....جوانی کی تصویر.....قبر.....اور پرانا صندوق......

صندوق کو تالا لگا ہوا تھا، جس کی چابی کہیں کھو گئی تھی، یا باپ نے دانستہ اسے نہیں دی تھی۔ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اماں کو بھی چابی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ تاہم یہ بات پورے گھر کو معلوم تھی کہ یہ صندوق خاص علی کے لیے تھا۔ میاں عنایت نے ہدایت کی ہوئی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد علی جب چاہے اس کو کھول سکتا ہے۔ اس کی اماں کو یقین تھا کہ اس میں ضرور کافی پیسے اور سونا ہوگا، جو میاں عنایت نے علی کے لیے محفوظ رکھا ہوگا۔ لیکن علی کا خیال دوسرا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب ابا جان نے اتنی زمین اور دولت، زیور، مال مویشی اس کے لیے چھوڑے ہیں تو صندوق میں یہی کچھ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اس کی بیوی کا خیال تھا کہ صندوق میں ابا جان نے کچھ پرانی اور خاص علم والی کتابیں رکھی ہوں گی۔ تم جانتی ہو مجھے کتابیں پڑھنے سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ کہتا۔ اسی لیے تو صندوق میں رکھی ہوں گی کہ تم ان کی طرح دانائی کی باتیں کتابوں سے سیکھو۔ وہ کہتی۔ دوسری طرف ایک بات کو گھر کے سب لوگ محسوس کرتے تھے کہ صندوق کو کھولنے کا جتنا انھیں تجسس ہے، اتنا ڈر بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

اس نے کئی بار صندوق کا تالا توڑنے کا ارادہ کیا، مگر ہر بار اس کے تجسس پر ڈر غالب آجاتا۔ خدا معلوم اس میں سے کیا نکلے۔ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں سنسناہٹ پیدا ہونے لگتی، اور کسی قدیمی ،بھولی بسری دنیا میں خود کو پاتا۔ اسے لگتا جیسے وہ اکیلا ایک غار کے سامنے ہے، اور اس میں سے عجیب وغریب مخلوق برآمد ہو رہی ہے، انسانی چہروں والے سانپ، سانپ کے چہروں والی عورتیں، سایوں سے بنی دیو قامت کوئی شے، جسے وہ پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ کبھی لگتا کہ ایک بڑی سی کتاب کے ورق پھڑ پھڑا رہے ہیں، جس پر طرح طرح کی تصویریں، جانوروں کی، برہنہ جسموں کی اور وہ کسی ایک کو بھی اچھی طرح دیکھنے سے قاصر ہے؛ وہ سب آپس میں گڈ مڈ ہو جاتیں۔ ایک ننگی ران پر وہ کسی بیل نما مخلوق کو کالی زبان پھیرتے دیکھتا۔ وہ سر کو جھٹکتا۔ تیز تیز چلتا، اور پھر رک کر لمبا سانس کھینچتا، اور خود کو کسی کام میں مصروف کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔

جیسے جیسے اس کے باپ کے انتقال کو وقت گزر رہا تھا، اسے باپ کی کہی ہوئی باتیں زیادہ یاد آنے لگی تھیں۔ وہ باتیں بھی اسے یاد آ رہی تھیں، جو اس کے باپ نے براہ راست اس سے نہیں کہی تھیں۔ وہ اس کی اماں سے کوئی بات کر رہے ہوتے، اپنے مزارعوں اور ملازموں سے، یا اپنے ملنے والوں سے کچھ کہہ رہے ہوتے، یا اس کے بیٹے کو پیار کرتے ہوئے کہہ رہے ہوتے؛ یہ سب باتیں اسے یاد آنے لگی تھیں۔ ہاں، بچے کے اندر باپ دادا درخت کی طرح ہوتے ہیں، وہ غیر ارادی طور پر اپنے ابا کی بات کی تائید کرتا۔

باپ کے انتقال کے کوئی چھ دن بعد، پہلی جمعرات کو اس کے باپ کی رسم قل تھی۔ رشتہ دار، دوست، پڑوسی، جاننے والے سب حویلی سے دائیں جانب خالی میدان میں دریوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ کھجور کی گٹھلیوں پر کلمہ شریف، درود شریف پڑھ رہے تھے۔ کچھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کے چھوٹے چچا نے اسے پگڑی باندھی۔ اس کے چچا نے اسے کچھ کہا، جس میں سے اس نے فقط سنا کہ....اب گھر کے بڑے....اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، جو دھندلی ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے بڑے ہونے کا مطلب، ابا جی تھا۔ وہ چھوٹا تھا کہ دادا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑا اور ابا اس کے لیے ایک ہی لفظ کے دو مطلب تھے، اور بڑے ہونے کا مطلب تھا خدا جیسا۔ اسے بچپن میں

دیکھا ہوا ایک خواب کبھی نہیں بھولا۔ وہ تیسری یا چوتھی جماعت میں تھا۔ سردیوں کی کوئی رات تھی۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک اونچے قد کا آدمی ہے، سب اسے دیکھ کر کہہ رہے ہیں، یہ خدا ہیں۔ اس کی شکل، قامت ابا سے ملتی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ سخت حیران اور خوش بھی تھا۔ اس نے ڈر کے مارے کسی کو یہ خواب نہیں بتایا تھا، مگر وہ جب بھی ابا کے چہرے کی طرف دیکھتا تو اسے وہ خواب یاد آتا، اور اس کا پورا جسم احترام و تقدیس کی کیفیت میں شرابور ہو جاتا۔ کالج کے دنوں میں اس نے اس خواب کے مطلب پر، خواب بتائے بغیر سرفرید سے بات کی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اسے حیرت اس بات پر نہیں ہوئی تھی کہ بچپن میں آدمی خدا کو باپ جیسی طاقت ور ہستی کے طور پر سمجھتا ہے، حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ اسے وہ خواب ایک قدیم ترین زمانے میں لے گیا تھا، جب پہلے پہل آدمی نے اپنی فانی دنیا کو ایک بلند ترین اور لافانی دنیا کی مدد سے سمجھنا شروع کیا تھا۔ اگر ایسا ہے تو آدمی اتنی موٹی موٹی کتابیں کیوں پڑھے؟ سب تو آدمی کے اندر ہے۔ اس نے سرفرید سے کہا تھا۔ ٹھیک کہتے ہو، مگر یہ بات بھی میں نے تمھیں ایک موٹی کتاب ہی سے بتائی ہے۔ دونوں ہنس پڑے تھے۔ پر اس وقت وہ اپنی زندگی کی ایک بڑی مشکل سے دوچار تھا۔

آج وہ سرخ رنگ کی ایک دری پر نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہوں کی دھند، ذہن میں پھیل رہی تھی۔ اس نے خود کو سمجھ سے بالا، اپنی زندگی کی بدترین الجھن، اور اس کی پیدا کردہ بے بسی میں گرفتار محسوس کیا۔ کوئی پگڑی باندھ کر اتنا بڑا بن سکتا ہے، جس کا تصور کوئی باپ کی صورت میں کرتا ہے؟ یہ اس کی بے نیازی سے گزرتی زندگی کی سب سے بڑی الجھن تھی۔ اسے یاد آیا: گرمیوں کی ایک سہ پہر۔ ابا جی اور اماں جی گھر کے صحن میں بیٹھے ہیں۔ وہ ایک دوست کے گھر گیا ہوا تھا، اور کوئی ایک ہفتے بعد گھر آیا تھا۔ سلام کیا۔ خیر خیریت پوچھی۔ اماں بولیں، تم ہماری پگڑی ہو، اتنے دن باہر نہ جایا کرو۔ اس وقت اس نے اسے بس سرسری لیا تھا، پر آج وہ سب ایک سنگین حقیقت تھا، جس کا اظہار کبھی کبھی، باتوں باتوں میں، یوں ہی ہوا کرتا تھا۔ ایک وقت کا سرسری پن، دوسرے وقت کی بدترین حقیقت میں کیسے بدل جایا کرتا ہے! وہ اس بات سے قطعی آگاہ نہیں تھا کہ پہاڑ جیسی سچائیاں اوّل اوّل ذروں کی صورت ظاہر ہوتی ہیں، اور یہ سیکھنے میں آدمی کو مدت گزر جاتی ہے کہ ذرے کا معمولی پن، ایک

Scanned with CamScanner

دھوکا، اور ایک اوٹ ہے۔ دھوکے پہ دھوکا کھاتا ہوا آدمی جب پہاڑ کے روبرو ہوتا ہے تو خود کو بدترین جہالت میں مبتلا پاتا ہے۔ ایک دھند ہے کہ اس کی آنکھوں اور ذہن پر کسی نامعلوم دنیا کی جارحیت بن کر چھائی ہوتی ہے۔ اس نے پگڑی کو ایک پہاڑ کی صورت اپنے سر پر محسوس کیا۔ وہ چیخ تک نہ سکا۔ اس نے خود کو باپ کی مانند محسوس کرنے پر مجبور پایا، اور ایک غیر معمولی حقیقت کے بھیانک جبڑے میں خود کو محسوس کیا۔ اماں میں بیٹا ہی رہنا چاہتا ہوں۔ پاس بیٹھے بزرگ جو اسے دلاسہ دے رہے تھے، وہ چونک پڑے۔ لگتا ہے باپ کی موت کا دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ میاں حیات نے کہا، جو اس کے والد کے قریبی دوست تھے۔

وہ حیران ہوتا کہ جن باتوں کو اس نے کئی بار بس سرسری سنا تھا، وہ کیسے اتنی وضاحت اور اتنی شدت سے اسے اب یاد آنے لگی تھیں۔ کئی رخنے تھے، جو روزنوں اور دریچوں میں بدلنے لگے تھے۔ لیکن اس نے ایک نئی بات دریافت کی تھی۔ اس پر کھلا کہ انھی باتوں کے طفیل اس کا اپنے باپ سے ایک نیا تعلق قائم ہو رہا ہے، جو باپ اور بیٹے کے تعلق سے سوا ہے۔

وہ زیادہ ڈرنے لگا تھا۔ اس نے صندوق کو بھلانے کی کوشش کی، مگر وہ جتنی کوشش کرتا اتنا ہی وہ صندوق آسیب بنتا جاتا۔ وہ آسیب سے نجات چاہتا تھا۔

ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ اسی صندوق میں بند ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ انوکھی بات یہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں صندوق کی دیواروں سے نہیں ٹکرا رہے۔ وہ چلانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اس کی آواز گلے ہی میں چکر کھا کر رہ جاتی ہے۔ کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا۔ اس کی بیوی اور دو سال کا بیٹا چارپائی پر سو رہے ہیں۔ وہ صندوق میں پڑے پڑے انھیں دیکھ لیتا ہے۔ اس کی بے بسی بڑھ جاتی ہے، اور رنج اور غصے کی ایک لہر اس کے دماغ سے ہوتی ہوئی، اس کی آنکھوں تک آ جاتی ہے۔ معاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ تھا، اور گلا رندھ گیا تھا۔

اگلی صبح اس نے صندوق اٹھایا جو زیادہ وزنی نہیں تھا۔ اتفاقاً وہ گھر میں اکیلا تھا۔ والدہ اور بیوی قریبی عزیزوں کو پرسہ دینے گئی تھیں، جن کے یہاں ایک دن پہلے ایک بزرگ کا انتقال ہوا

Scanned with CamScanner

تھا۔ ان کے جنازے میں وہ شریک ہوا تھا۔ نوکر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ صندوق کو کمرے کے فرش پر رکھے، وہ اس کے تالے پر ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہا تھا، اور اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ ان کی مدد سے اپنے ڈر کو کچل رہا ہے۔ اسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ باپ نے اس کے تالے کی چابی اس لیے اسے نہیں دی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی تالے کو کھولے۔ اچانک اس نے ہتھوڑے کو ایک طرف رکھا، اور خود کو ملامت بھری نظر سے دیکھا، یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ اسے ایک عام سے بات سمجھنے میں پانچ ماہ کیوں لگے؟ خیر، اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے تالے پر پے در پے ہتھوڑے کی ضربیں لگائیں۔ ایک مرتبہ تو ہتھوڑے کا ایک سرا، اس کے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر لگا، اور وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ پیتل کا بھاری تالا، بالآخر ٹوٹ گیا۔ ایک بار پھر ڈر نے اس کو آن لیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، خدا کو یاد کیا۔ اپنے باپ کی کوئی خاص بات یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یاد آیا، انتقال سے چند ماہ پہلے باپ نے کہا تھا، تو اکیلا میرا وارث ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھے۔ اس نے سوچا، کیا اس بات کا کوئی تعلق اس صندوق سے ہے؟ اس وقت تو اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس کا باپ اسے دعا دے رہا ہے۔ مگر اس وقت اس نے طے کیا کہ ضرور اس بات کا تعلق اسی صندوق سے ہے، ورنہ یہ بات اس وقت اسے کیوں یاد آتی۔ گزشتہ چند مہینوں میں اس نے اور باتوں کے علاوہ ایک یہ بات بھی دریافت کی تھی کہ چھوٹی چھوٹی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ہر بات کا تعلق، اس وقت کے ساتھ جوڑ لیا جائے، جس وقت وہ بات یاد آتی ہے۔ اگر آدمی ایسا نہ کرے تو وقت بدمست ہاتھی کی طرح اسے روندنے لگتا ہے، لیکن اس دریافت کا سب سے اہم حصہ چونکا دینے والا تھا، جسے اس وقت اس نے بس سرسری طور پر محسوس کیا، مگر آگے چل کر شدت سے۔ یہ کہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کوئی بات ٹھیک طرح سے یاد آئی، یا آدھی ادھوری یاد آئی، وہ بات چھوٹی ہے یا بڑی، یہاں تک کہ وہ سچی ہے یا جھوٹی، وہ یکساں طور پر وقت کے بدمست ہاتھی کو قابو میں لانے میں کارآمد ہوتی ہے۔ اس کے دل میں یقین پیدا ہو چلا تھا کہ آدمی اپنی چھوٹی سی دنیا میں ایک جنگ لگاتار لڑ رہا ہوتا ہے، وقت کے خلاف، اس میں سب سے بڑا ہتھیار یہی چھوٹی چھوٹی، سچی جھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

صندوق کے سامنے اکڑوں بیٹھے، اس نے سوچا میرا باپ دنیا سے چلے جانے کے بعد ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ اس نے مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔ یہ بات میں نے یاد نہیں کی، ابا نے میرے کان میں کہی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ لکڑی کے بے صندوق کا اوپر کا پٹ اٹھانے میں اسے تھوڑی مشکل پیش آئی۔ کچھ گرد اڑی، اور اس کی آنکھوں میں بھی پڑی۔ اس نے دو ایک مرتبہ آنکھیں جھپکیں، اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے نچلے حصے کی مدد سے باری باری دونوں آنکھوں ملیں۔ مرچ جیسی کسی شے نے دائیں آنکھ میں چبھن پیدا کی، مگر ایک پل سے زیادہ اس نے اسے محسوس نہیں کیا۔ مدت مدید کے تجسس سے اس کی آنکھ کی پتلیاں پھیل گئی تھیں، اور وہ صندوق کے اندر کی ساری کائنات کو ایک پل میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ صندوق کی اندرونی دیواریں نم سیاہ لگ رہی تھیں، اور جگہ جگہ کیلیں اور پتریاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب سی باس اس نے محسوس کی، جو نا گوار تھی نہ خوش گوار۔ اس نے دیکھا، صندوق میں بہت کم سامان تھا: کچھ پرانے کاغذ، ایک چھڑی، اور ایک آئینہ رکھا تھا۔ اس نے تینوں کو باری باری ٹھہر ٹھہر کر دیکھا۔ ایک پل کے لیے وہ تذبذب اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کی زد پر آیا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے لگا جیسے وہ عمارت دھڑام سے گر پڑی ہے جس کا طلسماتی خیال اسے اتنی دور تک کھینچ لایا تھا۔ اس کا دل بجھ سا گیا کہ وہ سب اس کے تجسس کے مقابلے میں معمولی تھا۔ وہ سامنے کی حقیقت کے معمولی پن کے روبرو تھا۔ اسے لگا کہ ایک عام سی حقیقت کا معمولی پن اس وقت غیر معمولی طاقت حاصل کر لیتا ہے جب وہ اس دنیا کے عین سامنے ظاہر ہوتا ہے، جسے آدمی کا پر تجسس تخیل پیدا کرتا ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا تجسس صرف ایک بند دنیا کو جاننے کی بے تابانہ آرزو سے کہیں سوا تھا؛ وہ کتنے ہی دوسرے جذبات کے دھاگوں سے ایک طلسمی دنیا تخلیق کرتا جاتا تھا۔۔۔ ڈر اور اچانک پھٹ پڑنے والی حیرت آمیز مسرت کا یقین اس طلسمی دنیا کے خیال سے بندھا تھا۔ اب اسے اس دھکڑ پکڑ نے گھیرا کہ وہ صندوق کو بند کر دے یا ان چیزوں کو دیکھے۔ وہ کافی دیر دودلی کی زد پر رہا۔ وہ بہ یک وقت سامنے اور سامنے سے کہیں پرے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک انکشاف نے اسے دودلی کی تکلیف دہ حالت سے نجات دلا دی، اور اسے ایک واضح فیصلے پر پہنچا دیا: سارا مسئلہ اس ٹوہ کا ہے جو چھپی ہوئی چیزوں کے لیے ہوتی ہے۔ یہی ٹوہ ہر چھپی ہوئی شے کو، شے نہیں

رہنے دیتی، اسے کسی اور دنیا کا ایک ایسا وجود بنا دیتی ہے، جو نہ تو پوری طرح خیال میں سماتا ہے نہ بیان میں آتا ہے، مگر آدمی کے خیال کی دنیا میں ایک آگ بھڑکائے رہتا ہے، لیکن جب شے سے پردہ اٹھتا ہے تو سامنے اس کا معمولی پن ہوتا ہے، اور اس معمولی پن کی ناقابل برداشت جارحیت ہوتی ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے، اسے کچھ ملاقاتیں یاد آئیں، جو شدید آرزو سے شروع ہوئیں اور ایک بیزاری پر ختم ہوئیں۔ ایک ہلکا سا غصہ اور دبا دبا سا رنج اس پر طاری ہونے لگا۔

اس نے معمولی پن کی اسی حالت، اور اس کے خیال سے پیدا ہونے والے رنج کی حالت میں سب چیزوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے پہلے کاغذ اٹھائے۔ حیرت کی بات تھی کہ کچھ زیادہ گرد نہیں تھی۔ جہازی سائز کے کاغذوں کا وہ پلندہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے تیزی سے سب کاغذ الٹ ڈالے۔ کسی کاغذ پر کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔ معمولی پن کا پیدا کردہ رنج اب مایوسی میں بدلنے لگا، اور اس کے تھوڑی دیر بعد اس پر ہیبت طاری ہوگئی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے جیسے خود سے سوال کیا، اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نتیجے پر پہنچا گیا۔ بما کیا۔ اب وہ ایک اور دنیا میں داخل ہورہا تھا۔ خود سے سوالوں کے جواب میں، وہ ساری تحیر آفریں بوالعجبی، وہ ساری مضحکہ خیز طرفگی، وہ سب ڈر، وہ سارے امید ورجا میں لپٹے وسوسے ایک منطقی انداز میں ظاہر ہونے لگتے ہیں، جن سے آدمی بچنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اب وہ مجبور تھا وہ سب سننے پر جو اس کے سوال کے جواب میں، خود اس کے اندر سے برآمد ہونے لگا تھا، لیکن اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے کسی اور دنیا سے آرہا ہو۔ ان پر بہت کچھ لکھا ہوا ہوگا۔ ابا جان صرف پڑھتے ہی تو نہیں ہوں گے، کچھ لکھتے بھی ہوں گے۔ میں نے ان سے یہ جاننے کی کوشش تھوڑی کی۔ انھوں نے ضرور کچھ میرے لیے لکھا ہوگا۔ لکھنا بہت ہی ذاتی قسم کا عمل ہے، سرگوشی کی مانند، اس میں وہ صرف انھی کو مخاطب کرتا ہے جو اس کے دل کے قریب ہوں۔ انھوں نے میرے لیے لکھا ہوگا... کیا لکھا ہوگا؟ کوئی نصیحت؟ کوئی کہانی؟ کوئی وصیت بھی ہوسکتی ہے، اسی لیے صندوق میں بند رکھا ہوگا... کوئی خاص راز بھی ہوسکتا ہے، جسے وہ مجھے اپنی زبانی نہیں بتا سکے ہوں گے، یا بتانا مناسب نہ سمجھا ہوگا، یا کسی مناسب وقت کا انتظار ہوگا انھیں ... ہوسکتا ہے، ان کی کوئی اور بھی کہیں جائیداد ہو، کوئی اور شادی ہو، میرے بھائی بہن ہوں، اس سب

Scanned with CamScanner

کی اطلاع ان میں دی گئی ہو،ان کی زندگی کا کوئی خاص ،کوئی خفیہ گوشہ ہو، جسے انھوں نے مجھ پر،صرف مجھ پر منکشف کرنا چاہا ہو، میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں، مجھے وہ اس سب کا وارث بنانا چاہتے ہوں گے ،جو کچھ انھوں نے اپنی ستر سالہ زندگی میں حاصل کیا،انھیں میرے بالغ ہونے ،سمجھ دار ہونے ،وراثت کے قابل ہونے کا انتظار ہوگا، میں نے ان کے جیتے جی ان سے خود کو کتنا دور رکھا،خود کو ایک نامعلوم سی طاقت کے سپرد کیے رکھا، جو مجھے عیش،کھیل کود، جھگڑوں کی دنیا میں لے جاتی ،ابا میں کتنا صبر تھا، باپ کا دوسرا نام صبر ہے کیا؟ بیٹے کو سب کچھ سپرد کر دینے کے صحیح وقت تک صبر.... پر وہ سب کچھ کہاں گیا؟ کیا ابا جان نے کسی ایسی سیاہی سے لکھا تھا جو اندھیرے میں اڑ گئی ہو...لیکن ابا جان میرے نام لکھی گئی تحریر میں کچی سیاہی کیسے استعمال کر سکتے ہیں ....ضرور کوئی دوسری بات ہوگی ....ہوسکتا ہے،ابا جان کا لکھا میری غفلت کے سبب مٹ گیا ہو۔ضرور اس لفظ کا تعلق اس آدمی سے ہوتا ہے،جس کے لیے وہ لفظ لکھا جاتا ہے۔لفظ کا تعلق آدمی سے نہیں تو کس سے ہوسکتا ہے؟لفظ کا آدمی سے تعلق ہے تو لفظ آدمی کی طرح زندہ بھی ہوتا ہے....ہوسکتا ہے،لفظ اس کا انتظار کرتے رہے ہوں، جب میں نہیں آیا تو سخت مایوسی کے عالم میں انھیں موت آ گئی ہو.... پر لفظ کو موت کیسے آ سکتی ہے؟ جس طرح تعلق کو موت آتی ہے۔تعلق کی عمر ہے تو لفظوں کی بھی تو عمر ہوتی ہوگی...سارے جھگڑے ہی عمر کے ہیں.....عمر ہے تو انتظار بھی ہے.....مایوسی بھی ہے......دنیا کو دینے کے لیے کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کی خواہش....اور اس کی پیدا کردہ الجھنیں....ان الجھنوں سے نکلنے کی ایک نئی خواہش....اور اس کی مایوسی....عکس ہی عکس.....وہ لفظوں کی طاقت سے اس وقت سے واقف چلا آتا تھا، جب وہ چار یا پانچ سال کا تھا۔اس کے باپ نے اسے کہا تھا کہ اپنا نام لکھو۔اس نے ایک کاغذ پر اپنا نام لکھا۔ باپ نے کہا کہ اسے سنبھال کر رکھو۔اگر آئندہ دس سال تک تم اسے اپنے پاس محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے تو ضرور بڑے آدمی بنو گے۔ایک سال بعد باپ نے پوچھا کہ کاغذ کا وہ ٹکڑا کہاں ہے۔وہ گم ہو گیا تھا۔ باپ خاموش ہو گیا۔ باپ کی چپ اور وہ گم شدہ کاغذ اس کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے چپک گئے۔اسے خیال آیا کہ ان خالی کاغذوں کا کوئی تعلق ،اس واقعے سے ہے؟ پھر اچانک اسے ایک مضحکہ خیزی نے گھیرا۔وہ تو بس اس صندوق کو دیکھنے آیا تھا ،اور کن خیالوں میں الجھ گیا ہے۔اگر کچھ آدمی کی توقع کے خلاف واقع ہو تو اس سے کون سی قیامت آ جاتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ پھر قیامت بھی آجائے تو کیا فرق پڑتا ہے! اس نے معمولی پن کی، ایوسی اور خالی پن کی دبیت سے نکلنے کی کوشش کر ڈالی۔

وہ لاٹھی اور آئنے کی طرف متوجہ ہوا۔ لاٹھی صندل کی لکڑی کی تھی۔ اس کی خوشبو نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے دستے سے لاٹھی پکڑی۔ دستہ پیتل کا بنا ہوا تھا۔ خنکی اور سختی کا احساس بہ یک وقت ہوا۔ لاٹھی پر دائیں ہاتھ ٹکاتے ہوئے، وہ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کو لگا کہ اس کا ہاتھ پیتل کے دستے پر نہیں، کسی مضبوط، مانوس ہاتھ میں ہے۔ ایک تیز سی لہر اس کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ اس نے لاٹھی کا دستہ سینے سے لگایا، پھر چوما۔ تو میرا سہارا بنے گی، جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اس نے اسے وہیں صندوق میں رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

اب آئنے کی باری تھی۔ آئنے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہی، اسے لگا کوئی اسے روک رہا ہے، اور کہہ رہا ہے، دھیان، احتیاط۔ بچپن میں یہ دونوں لفظ اس نے سیکڑوں بار سنے تھے۔ وہ جب بھی اپنے ابا کے منھ سے یہ لفظ سنتا، چوکنا ہو جاتا، اپنی رفتار آہستہ کر لیتا، لیکن ایک عجب طرح کا ڈر اسے گھیر لیتا۔ ایک بار، جب وہ بارہ چودہ برس کا تھا، ابا کے لیے حقہ اٹھانے آیا۔ ابا نے کہا، ذرا دھیان سے، احتیاط سے میرے شیر۔ اس نے آہستہ سے حقے کی نڑی پکڑی جس پر سنہری تاروں کا کام تھا، اور دھیان جمانے کی کوشش کی، لیکن اسی لمحے اسے اس ڈر نے آن گھیرا کہ اگر حقہ گر گیا تو... بس اسی لمحے اس کے ہاتھ سے حقہ گر گیا۔ حقے کا پینداپیتل کا تھا، مگر چلم مٹی کی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی، اور نیم بجھے انگارے اس کے پاؤں کے آس پاس گر گئے۔ اوہو۔ اس کی ماں نے دیکھا تو تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی، دعا اور صلواتیں سناتی ہوئی۔ میرے بچے کچھ ہوا تو نہیں۔ تو سارا دن ہاتھ میں کتاب لیے حقہ پیتا رہتا ہے۔ گھر میں نوکر مر گئے ہیں، یا میں۔ اس نے دیکھا، ابا پریشان نہیں ہوئے۔ جب اماں کا غصہ بڑھا اور ان سے براہ راست مخاطب ہوئیں تو وہ مسکرا دیے، اور کہا۔ بچے نے کچھ گنوایا نہیں، کچھ سیکھا ہے۔ اس کے کپڑوں پر انگارے گر جاتے تو... مگر تم نے پھر بھی سبق نہیں سیکھنا۔ تم روز ہی تو مجھے سبق سکھاتی ہو۔ ابا کھلکھلا کر ہنس دیے۔ پھر اچانک سنجیدہ ہوئے۔ آدمی کو زندگی میں بہت کچھ چاہیے، مگر دھیان سب سے زیادہ، اور وہ بیٹھے بٹھائے نہیں

Scanned with CamScanner

ملتا۔ آج اس نے یہ سیکھا ہے کہ دھیان سے ڈر کو الگ نہ کیا جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اماں نے ابا کی بات کو نہیں سنا تھا، اور وہ اس کے کپڑوں کو جھاڑ رہی تھیں، اور پوچھ رہی تھیں، کچھ ہوا تو نہیں۔ اماں نے ایک ٹھوکر بھی چلم کو دے ماری تھی، جس سے وہ دور جا گری، اور اس کی تہ میں گڑ ملا تمبا کو نظر آنے لگا تھا۔ ابا بولے تھے، ذرا دھیان سے۔ وہ آئنہ ہاتھ میں پکڑے یاد کر رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے یہ سیکھا تھا کہ دھیان سے ڈر کو الگ کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ڈر کو اپنا کام کرنے دیں اور دھیان کو اپنا۔

اس نے دیکھا کہ وہ لکڑی کے منقش فریم میں جڑا ہوا بیضوی آئنہ تھا۔ اس کی پشت ابھری ہوئی تھی، اور اس پر نقش بنے ہوئے تھے، لال اور کلیجی رنگ کا استعمال زیادہ تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن سے اس کو دونوں طرف سے صاف کیا، اور دامن کو جھاڑ دیا۔ کچھ زیادہ گرد نہیں تھی۔ اسے معمول سے زیادہ نظر آنے لگا تھا۔ جس کمرے میں وہ صندوق کے سامنے بیٹھا تھا، وہ خاصا بڑا تھا۔ وہ کمرے کے درمیان میں فرش پر ایک چادر بچھا کر بیٹھا تھا۔ سامنے چھت سے ذرا نیچے پڑچھتی تھی، جس پر کانچ اور پیتل کے برتن رکھے تھے۔ اس سے نیچے لکڑی کا ایک بڑا فریم تھا، جس پر ٹین کی بنی دو بڑی پیٹیاں اور لکڑی کے چار بڑے صندوق تھے۔ تین چھوٹے صندوق بھی تھے، جو ٹین کے بنے ہوئے تھے۔ سب کپڑوں، رضائیوں، دلائیوں، کھیسوں سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک میں زیورات موجود تھے۔ دائیں ہاتھ تین، منقش پایوں والے کھٹڑے ایک دوسرے کے اوپر کھڑے کیے گئے تھے۔ سب پر تازہ دھلی ہوئی چادریں ڈالی گئی تھیں۔ یہ سب اسے ابھی ابھی نئے سرے سے نظر آنے لگا تھا۔ یہ اس گھر کا سب سے پرانا کمرہ تھا جو اس کے دادا نے بنوایا تھا۔ اس کے والد نے اسے اس کی اصلی شکل میں رہنے دیا تھا۔ کہتے تھے گھر میں پرکھوں کی اشیا کو چھیڑنا چاہیے نہ بدلنا چاہیے۔ جس دن ہم نے گھر سے اپنے باپ دادا کی چیزوں کو نکال دیا، سمجھیں انھیں دل، دماغ، گھر، صحن، خاندان سے نکال دیا۔ باقی کیا بچا؟ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں ایک عجب باس ہے۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا تو اسے لگا کمرے کی دیواروں کا پلستر کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا ہے، جس سے یہ باس آرہی تھی، اور ہاں فرش بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ بائیں جانب ایک ترپڑ

Scanned with CamScanner

ہے۔اس سے احمد کو ٹھوکر بھی لگ سکتی ہے۔جلد ٹھیک کرواؤں گا۔اسے لگا کمرے میں کچھ اور بھی محسوس ہو رہا ہے،صندوقوں، پیٹیوں، کپڑوں کی باس بھی ہے۔اسے اپنی بغلوں سے بھی ایک باس محسوس ہوئی۔یہ مسلسل آواز سی کیا آرہی ہے۔اس نے چاروں کونوں کی طرف نگاہ کی۔کوئی جھینگر بول رہا ہے۔یہ جھینگر نظر نہیں آتے،مگر دن ہو کہ رات،شور بہت مچاتے ہیں۔خدا جانے یہ کھاتے پیتے کیا ہیں۔اسے فرش کافی سخت محسوس ہوا،اور اس نے نشست کا انداز بدلا۔وہ چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔اس کے سارے حواس پوری طرح جاگ گئے تھے۔

آئنے کی پشت پر ایک پھول بنا ہوا تھا۔وہ نہ تو گلاب کا پھول تھا،نہ موتیے اور چنبیلی کا۔وہ کچھ کچھ گیندے سے ملتا جلتا تھا۔کاری گر نے یہ کوشش کی تھی وہ صرف اسی کا بنایا ہوا پھول نظر آئے،اور اسے دیکھتے ہوئے کسی اور پھول کی طرف دھیان نہ جائے۔خدا جانے ابا نے یہ کہاں سے اور کب آئنہ بنوایا تھا،یا ابا کو بھی یہ آئنہ وراثت میں ملا تھا۔ہوسکتا ہے دادا کے زمانے کا ہو،یا اس سے بھی پہلے کا۔وہ اپنے گاؤں کے ان دونوں ترکھانوں کو اچھی طرح جانتا تھا،جو ہر دوسرے تیسرے سال انھیں منقش کھٹرے اور پیڑھے بنا کر دیا کرتے تھے،اور بدلے میں سال بعد گندم لیا کرتے تھے۔اسے یاد آیا، سب کمروں میں ایک ایک آئنہ بھی ہے،جس کا فریم لکڑی کا ہے،مگر وہ سیاہ لکڑی کا ہے،جس پر کوئی نقش نہیں بنا۔اسے یہ کبھی معلوم نہیں ہوا،نہ اس نے جاننے کی کوشش کی کہ وہ آئنے کب سے ہیں،اور کہاں سے آئے۔آدمی اپنے ہی گھر کے بارے میں کس قدر کم جانتا ہے!اسی لمحے اسے خیال آیا کہ اگر اس نے یہ جاننے کی کوشش شروع کی کہ گھر میں کوئی چیز کہاں سے آئی،اور کب سے آئی تو شاید اس کی عمر اسی کام میں بیت جائے،مگر اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ ایک بہت دل چسپ مہم ہوگی۔اس سے وہ اپنے گھر کی تاریخ سے واقف ہو جائے گا۔آخر گھر کی ہر شے سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے۔وہ جو کچھ ہے،اس میں ابا ماں کے علاوہ گھر کی چیزوں کا بھی حصہ ہے۔وہ ضرور کچھ چیزوں کی اصل کو جاننے کی کوشش کرے گا۔وہ پہلے ابا اماں کے بارے میں جاننا چاہے گا کہ وہ کہاں سے آئے تھے،پھر... ہاں گھر میں ایک پلنگ موجود ہے۔اس جیسا پلنگ اس نے آج تک کہیں نہیں دیکھا۔اس پلنگ پر صرف ابا سوتے تھے،اس کے بعد اس پر کبھی کوئی نہیں بیٹھا۔پلنگ سے اسے اچانک ایک یاد پانی کے تیز دھارے کی

Scanned with CamScanner

مانند آئی۔ ایک شام وہ ساتھ والے کمرے میں گیا۔ مزدوروں کو کچھ پیسے دینے تھے جو الماری میں رکھے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اماں مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ بائیں جانب وہ پلنگ تھا جس پر آسمانی رنگ کی چادر بچھی تھی، اور یہی وہ چادر تھی جس پر ابا آخری بار بیٹھے تھے۔ اس نے احتیاط سے قدم رکھے کہ کھٹکا نہ ہو، اور اماں کا دھیان منتشر نہ ہو۔ اسے لگا کمرے میں اماں کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ ایک مانوس، حیرت خیز، مگر حواس کو معطل کر دینے والی موجودگی اسے محسوس ہوئی۔ ایک ڈر اس پر اچانک طاری ہوا۔ اس نے دیکھا پلنگ پر ابا نیم دراز ہیں، اور اماں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن... میں ابا کو پہچاننے میں کیسے غلطی کرسکتا ہوں؟ مگر وہ یہاں کیسے؟ مگر وہ یہاں ہیں۔ سفید تہ بند، ہلکے بھورے رنگ کے کرتے، اور مٹھی بھر سفید ڈاڑھی، اور سفید سر... اس کا جی چاہا، وہ ابا سے لپٹ جائے، ابھی اس نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ابا غائب ہو گئے۔ اسی دوران میں اماں نے سلام پھیرا۔ آپ نے کچھ دیکھا۔ اس نے ڈر، مسرت اور عجلت میں اماں سے کہا۔ ہاں، بیٹا تجھے دیکھا۔ نہیں ابا کو۔ ہاں بیٹا، مجھے تو ہر وقت لگتا ہے کہ وہ یہاں ہیں، اس پلنگ پر، اسی لیے تو میں اس پر کسی کو بیٹھنے نہیں دیتی۔ جس دن اس پر کوئی بیٹھ گیا، اس دن وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ اماں نے یہ سب ایسے کہا، جیسے یہ معمول کی بات ہو۔ لیکن اماں میں نے آج ابا کو یہاں دیکھا ہے، وہ پلنگ پر بیٹھ گیا، جیسے ابھی ابا انھیں گلے لگا لیں گے، بالکل وہی تھے اماں۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم نے نہیں دیکھا۔ لیکن اب شاید وہ یہاں نہ آئیں۔

اسے آئنے کو ہاتھ میں پکڑے کافی دیر ہوگئی تھی۔ کسی خاص وجہ سے، جسے وہ اس وقت سمجھنے سے قاصر تھا، اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ جیسے ہی آئنہ دیکھے گا، اس میں ابا کی شکل نظر آئے گی۔ کتنے سالوں بعد وہ ابا کی صورت، اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس کے ذہن میں ایک یاد کا جھماکا سا ہوا۔ اس نے آخری بار ابا کا چہرہ انھیں دفن کرنے سے کچھ دیر بعد پہلے، دن کے پہلے پہر دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، مگر چہرے پر ایک منجمد سی چمک تھی، جو سرخ پھولوں میں ذرا دور کھڑے ہونے سے واضح طور پر دکھائی دیتی تھی۔ خواب میں اس نے ابا کو کئی بار دیکھا تھا۔ خوابوں میں ہمیشہ یوں لگتا جیسے ابا مرے نہیں ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ خواب مین ہر دفعہ وہ ابا کے ساتھ کسی گاڑی

Scanned with CamScanner

میں سوار ہوتا۔ وہ گاڑی چلا رہا ہوتا اور ابا فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوتے۔ ایک خواب اسے کبھی نہیں بھولا، جو اس نے کچھ ماہ پہلے دیکھا تھا۔ وہ ایک جیپ میں پکی سڑک پر جا رہے ہیں۔ دونوں کوئی بات آپس میں نہیں کرتے۔ وہ ایک موڑ مڑتے ہیں۔ اب گاڑی ایک نہر کے کنارے بنی کچی سڑک پر ہے۔ اسے گاڑی چلانے میں کافی دقت ہو رہی ہے۔ اچانک سامنے ایک کھڈا آتا ہے۔ گاڑی لڑکھڑاتی ہے، بے قابو ہوتی ہے اور بائیں جانب، جہاں سرکنڈوں کا جنگل ہے، اس طرف پھسل جاتی ہے۔ اس کے فوراً بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ گاڑی نہر میں کیوں نہ گری، سرکنڈوں کی جنگل کی طرف کیوں گئی؟ یہ کس بات کا اشارہ تھا؟ اس نے اس اشارے کا یہ مطلب سمجھا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی انوکھی بات رونما ہونے والی ہے، ویسی ہی جیسی جنگل میں ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے اسے کچھ دشمنوں کا سامنا ہو جو جنگل میں چھپے ہوں۔

اس نے بیداری کی حالت میں ابا کا چہرہ ذہن میں لانے کی کافی کوشش کی، مگر وہ مرتعش پانی میں لڑکھڑاتے عکس کی مانند دکھائی دیتا، یا کچی پنسل سے بنی کسی ایسی تصویر کی طرح، جس پر ایک شرارتی بچے نے بے ہنگم لکیریں کھینچ دی ہوں۔ آئینہ ہاتھ میں پکڑے، وہ ابا کے لیے ناقابل برداشت مونجھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سخت بے چین، اور اس سے زیادہ پرجوش تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے کیوں نہیں سوچا کہ وہ ابا کو دیکھتے ہی کیا کہے گا۔ پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا، صرف دیکھے گا۔ جو کچھ کہیں گی، اس کی آنکھیں کہیں گی۔ جس تذبذب یا بے بسی کا سامنا زبان کو ہوتا ہے، آنکھوں کو نہیں ہوتا۔ اسے ابا کی صرف ایک بات یاد آئی: دھیان۔ اس نے دھیان کی پوری طاقت سے آئینہ اپنے آگے کیا۔ پہلے آنکھیں بند کیں۔ بند آنکھوں میں پہلی بار اسے ابا کی شبیہ ساکن اور مکمل حالت میں نظر آئی، البتہ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ابا کی شبیہ اس پرانے بلیک اینڈ وائٹ فوٹو کی طرح تھی۔ اس طرح کی کئی تصاویر ان کے گھر کی دیواروں پر ٹنگی تھیں۔ اسے ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا کہ آئنے میں ابا کا عکس رنگین ہوگا۔ اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ آئنے میں دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ چکرا گیا۔ آئنے میں ابا نہیں تھے۔ وہ بھی نہیں تھا۔ آئنے میں بے شمار آدمی تھے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دروازے سے صحن نظر آ رہا تھا، جہاں ذرا فاصلے پر ایک بوڑھی نوکرانی کسی کام میں

Scanned with CamScanner

مصروف تھی۔ گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں، اور آئنے میں دوبارہ دیکھا۔ اب آدمی بدل گئے، مگر تعداد میں پہلے بھی سے بھی بڑھ گئے۔ آئنہ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ تھا، اور زبان پر یااللہ یااللہ تھا۔ اس نے آئنہ صندوق میں رکھا۔ تیزی سے صندوق کا ڈھکن بند کیا، صندوق کو اس کی جگہ پر پٹخا اور باہر آگیا۔

یہ تمھارا وہم ہے۔ آئنے میں دوسرے کیسے نظر آسکتے ہیں؟ میاں حیات بولے، جو اس کے ابا کے جگری دوست تھے۔

چاچا، کاش یہ میرا وہم ہوتا۔ مجھے ہمت نہیں پڑی ورنہ میں وہ آئنہ لے آتا۔ اس نے میاں صاحب کے ڈیرے پر پڑے کھٹولے پر پہلو بدلتے اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

ایسا کرو، اب لے آؤ، مگر پہلے شربت تو پی لو جو کب سے نوکر بے چارہ لے کر کھڑا ہے۔ میاں صاحب نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ اگر میں وہ آئنہ لے آیا تو راستے میں وہ سب لوگ باہر نکل آئیں گے، اور مجھے....

چھڈ یار علی، تیرا ابا تو بہادر تھا، تو اتنا ڈرپوک.... میاں نے فہمائش کی۔

چاچا، میری بات کا یقین کر... میاں صاحب کی باتوں سے اسے بھی شک ہونے لگا کہ شاید وہ صندوق کے سامنے کافی دیر بیٹھا بیٹھا تھک گیا تھا، اس لیے شاید وہ سب وہم ہو۔ کاش ایسا ہی ہو!

اچھا میں خود تیرے پاس آؤں گا۔ کل، نہیں کل تو مجھے شہر جانا ہے، ایک مقدمے کی تاریخ ہے، اگلے ہفتے آؤں گا۔ پر میرے پتر کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرنا، ورنہ سب کہیں گے، تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہاں ایک زمیندار کا دماغ چل جائے تو اس کی زمینوں پر دوسروں کے ہل چلنے لگتے ہیں۔ میاں صاحب نے کہا۔

وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ وہ اپنی چارپائی، صحن کے ایک کونے میں ڈلواتا تھا۔ وہ چار پانچ مرتبہ اٹھ کر صحن کا چکر لگا چکا تھا، اور دروازہ کھول کر باہر بھی ایک چکر لگا آیا تھا۔ وہ اپنے ڈیرے پر بھی

Scanned with CamScanner

گیا، جہاں اس کے تین ملازم چار پائیوں پر دراز خراٹے لے رہے تھے، اور ایک طرف بندھے جانور کسی کسی وقت ڈکراتے تھے۔ وہ چار پائی پر لیٹا لیٹا، ڈر رہا تھا کہ اگر اسے نیند آ گئی تو جو اجنبی چہرے اس نے آئنے میں دیکھے ہیں، وہ اسے خواب میں دکھائی دیں گے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کر سکا تھا کہ آئنے کے عکسوں اور خوابوں کے عکسوں میں کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں، مگر اسے اس بات کا قوی یقین تھا کہ جو انہونی آئنے میں ہوئی ہے، اس سے بڑی انہونیاں خوابوں میں ہوتی ہیں۔ جیٹھ کی یہ ہلکی سی گرم رات، اُدھر سوئے ہوئے اس کی بیوی اور بچہ، اور یہاں چار پائی پر بچھے بستر میں جاگتا اور کروٹیں بدلتا مَیں، چاند کی آخری راتوں میں سے اِس ایک رات کے آسمان میں روشن ستارے، جھینگروں کی یہ آوازیں، اور ذرا ذرا دیر کو کتوں کے بھونکنے اور دور کھیتوں کے کسی کنارے میں ان بھیڑیوں کی آوازیں جو موقع ملتے ہی غریب کسانوں کی بھیڑ بکریاں اٹھا لے جاتے ہیں... یہ سب ایک سچائی ہے، اتنی ہی ٹھوس جتنی... جتنی میری چار پائی کا یہ پایہ.. اور اتنی ہی واضح جتنی یہ میری کھلی آنکھیں... مگر اسی ٹھوس اور واضح سچائی کے ساتھ آئنے اور خوابوں میں ظاہر ہونے والی شبیہیں اور عکس۔ یہ خیال آتے ہی اسے کپکپی محسوس ہوئی۔ یہ کیا؟ میں کہاں آ گیا ہوں؟ وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ابھی ابھی جس خیال نے اسے ڈرایا ہے، وہ پہلے کبھی اس سے واقف نہیں ہوا تھا۔ اس خیال کا نیا پن، ذرا سا دل چسپ ضرور تھا، اسی لیے اس نے خواہش کی کہ وہ اس پر مزید غور کرے، یا اس پر گرفت رکھے... خیال پر گرفت... وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا... مگر اس خیال کی اجنبیت وحشت ناک تھی۔ وہ ایک دہری کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے یاد کیا: میں نے یا تو آدمی دیکھا ہے، یا اس کا سایہ۔ وہ دنیا کس قدر محفوظ اور جینے کے قابل ہے جہاں آدمی اور سایہ الگ الگ رہیں، جہاں ایک شے کی حد میں دوسری شے کی تشدد آمیز مداخلت نہ ہو۔ لیکن وہ دنیا جہاں سایہ اٹھ کر چلنے لگے، اور آدمی کھڑا کا کھڑا رہ جائے.... اس دنیا کی تاب لانا آسان نہیں۔ سایہ، آدمی کی خاصیت اختیار کر لے، اور آدمی اس اچانک آ پڑنے والی افتاد کو سمجھنے میں خود کو بری طرح بے بس محسوس کرے۔ یہ تو سیدھی سادی جارحیت ہے، ایک غیر مبہم تشدد ہے، اس نے جیسے کسی کو مخاطب کر کے احتجاج کیا۔ میں بچپن سے آئنے میں عکس دیکھتا آیا ہوں۔ میرے ذہن میں کبھی ...ایک پل کے لیے یہ خیال بھی نہ آیا کہ.... میں اپنی صورت کو آئنے کے عکس ہی سے پہچانتا ہوں....

Scanned with CamScanner

واقعی؟...اتنی عام سی بات میرے ذہن میں پہلے کیوں نہ آئی،لیکن کیا واقعی یہ عام سی بات ہے؟ آئنہ تمھیں بتائے کہ تمھارا چہرہ کتابی ہے،تمھاری ایک آنکھ کا رنگ دوسری سے ذرا مختلف ہے،تمھارے دائیں گال پر تل ہے،تمھاری پیشانی پھیلتی جارہی ہیں،تمھاری مونچھوں میں سفید بال آرہے ہیں،اور تم کبھی خوش ہواور کبھی رنجیدہ،کیا یہ عام سی بات ہے؟ دیوار پر لٹکا آئنہ روزانہ تمھیں کچھ نہ کچھ بتائے،اور تمھیں یہ جاننے میں تیس سال لگ جائیں کہ تم دنیا سے وہی معاملہ کرتے ہو،جس کی ترغیب تمھیں آئنے سے ملے۔یہ واقعی عام سی بات نہیں،لیکن جب اسی آئنے میں تمھیں اتنے سارے عکس نظر آئیں....اور وہ عکس کسی اور کے ہوں،اور وہ آدمی کو گھور کر دیکھنے لگیں...تو...تو..اسے لگا وہ سارے عکس ایک مرتبہ پھر اسے گھورنے لگے ہیں،نہیں یہ تو مجھ پر یلغار کرنے لگے ہیں۔اس نے آنکھیں بند کر لیں،اور اپنے اندر ہذیان آمیز مزاحمت کی شدید حالت محسوس کرتے ہوئے،ادھر ادھر ہاتھ چلائے۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔میں....میں سب کو....مگر میں...انھیں....کیسے مار سکتا ہوں؟تمھیں یقین ہے کہ وہ عکس تھے،آدمی نہیں؟ جیسے انھی میں ایک عکس اس سے مخاطب ہوا۔

یہ میں کہاں آگیا ہوں...یہ کون سی دنیا ہے جہاں آدمی دور بھیڑیے کی حقیقی آواز سے نہیں ڈرتا،مگر آئنے کے اس عکس سے ڈر جاتا ہے،جس کے بارے میں شک ویقین ادلتے بدلتے رہتے ہیں،اور اس کے خواب میں ظاہر ہونے سے ڈر جاتا ہے۔ایک بھیڑیے اور کتے کا سامنا کرنا آسان ہے،وہ انھیں ڈرا سکتا ہے،انھیں چوٹ پہنچا سکتا ہے،یا کم از کم ان سے بھاگ تو سکتا ہے،مگر ایک عکس .....نہیں کئی عکس....نہیں کئی آدمی...اور ان کی یاد....نہیں خود ان کا مقابلہ کرنا،کم از کم میرے اختیار میں نہیں!!!اس نے آئنے کو تو الٹا کر رکھ دیا تھا۔لیکن اگر یہ خواب میں بھی آگئے تو...خواب میں تو آدمی بالکل بے بس ہوتا ہے۔اسے اپنے کئی خواب یاد آئے،جن میں اس نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا تھا تو اسے لگا تھا جیسے اس پر فالج گر گیا ہو،پاؤں اٹھانا چاہے تو من من کے ہو گئے تھے۔

رات کا کون سا پہر تھا،اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔وہ بس سوچے جارہا تھا،اور بے اختیاری محسوس کررہا تھا۔اسے اپنے ذہن پر اختیار نہیں رہا تھا۔بے اختیاری کی حالت سے نکلنے کی جتنی جدوجہد کرتا،اتنا ہی الجھ جاتا۔اچانک اسے ایک پرانا واقعہ یاد آیا۔سکول کا زمانہ تھا۔اس نے سجاد،

Scanned with CamScanner

جو اس کا ماموں زاد تھا، اس سے دوڑ نے کا مقابلہ کیا۔ سجاد اس سے آگے نکل رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی، مگر وہ ہاتھ چھڑا کر مزید تیز بھاگنے لگا۔ اسے اچانک شرارت سوجھی۔ وہ دیکھو سانپ۔ وہ چلایا۔ سجاد گرتے گرتے بچا۔ اتنے میں وہ آگے نکل گیا۔ تم نے بے ایمانی کی، سجاد چیخا۔ اس نے تیزی سے کام کرتے ذہن کو روکنے کا یہی گر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دیکھو، سانپ۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا ذہن اس سانپ کے بارے میں سوچنے لگا، جس کا ذکر اس نے سجاد سے اس وقت کیا تھا۔ اس کا ذہن، اس کے ارادے کے بغیر ایک خیالی سانپ کے نقش بنانے لگا۔ ایک اژدہا ہے جس پر جہاں تک نگاہ جاتی ہے، وہ گھسٹتا جارہا ہے۔ وہ مزید ڈر گیا۔ اسے لگا اس کے سر میں ایک مشین لگی ہے، جو تیزی سے چل رہی ہے، اور جس سے کٹے پھٹے، چھوٹے بڑے، ادھر ادھر کے خیالات برآمد ہو رہے ہیں۔ اس کے سر میں نصب اس مشین کا کوئی تعلق، اس کی ذات سے نہیں ہے۔ اس نے سوچا، حالاں کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ذات کے بارے میں بہت ہی مبہم سا علم رکھتا ہے۔ وہ اس مشین کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اس کی کھوپڑی پھٹ جائے گی۔

اس کا کیا طریقہ ہو؟ وہ کہاں جائے؟ کس سے مدد چاہے؟ اگرچہ اس نے خود اپنے سوال کے مضحک پن کو محسوس کیا، مگر حیرت انگیز طور پر اس کے ذہن کی مشین جیسے رک سی گئی۔ ہونہہ، تو سوال ذہن کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے خود سے ایک نیا سوال کیا۔ آئینے میں کس کے عکس تھے، کون لوگ تھے؟ اس نے خود پر معمولی سا اختیار محسوس کیا۔ اس نے آئینے میں دیکھے ہوئے آدمیوں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ ذہن پر کافی زور دیا۔ اگرچہ وہ ڈر گیا تھا اور توجہ سے انھیں نہیں دیکھ سکا تھا، مگر ایک چیز کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ کچھ عکس اور صورتیں اس کے ذہن سے چپک گئی ہیں۔ اس نے ایک ایک صورت پر دھیان مرکوز کرنے کی کوشش کی، مگر اس وقت اسے صرف ایک آدمی کی صورت کچھ کچھ شناسا سا لگی۔ پر اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کون تھا، اور اسے اس نے کہاں اور کب دیکھا تھا۔ معاً اسے یاد آیا، اس کی صورت، اس کی اس تصویر سے ملتی جلتی تھی جو اس نے دسویں جماعت کے دنوں میں ہائی سکول کی دیوار سے ملحق فوٹو گرافر کی دکان سے بنوائی تھی، اور ان کے گھر کی ایک دیوار پر فریم میں جڑی

Scanned with CamScanner

ہوئی لگی تھی۔لیکن اس نے اسے کافی عرصے سے دیکھا نہیں تھا۔شاید وہ اس کا کوئی ہم جماعت ہو،لیکن ذہن پر مزید زور ڈالا تو معلوم ہوا کہ وہ آدمی بالکل اس کی اپنی تصویر کی مانند تھا۔شاید میں خود ہی ہوں، جسے میں دوسروں کے جھرمٹ میں اور خوف کے مارے پہچان نہیں سکا،لیکن میں.....وہ لڑکا.....جو مجھے بھی بھول چکا ہے،جس کی یاد بس وہ ایک تصویر ہے،وہ کیوں کر اس آئینے میں آسکتا ہے؟اس کا جواب تو آسان ہے،اس نے جیسے خود سے کہا۔جیسے باقی لوگ آئینے میں آئے،وہ بھی آ گیا۔لیکن کیا واقعی وہ میری تصویر ہی کا عکس تھا،جو زندہ ہو گیا تھا؟وہ باقی سب کے ساتھ کیوں تھا؟یہ سوال اسے پریشان کیے دے رہے تھے۔اس نے اس عکس پر سوچنا چھوڑا،اور کسی اور کو یاد کرنے کی کوشش کی،مگر اسے لگا کہ سب اجنبی تھے۔ان کی شکلیں اس کی یادداشت کے کسی کونے میں شاید محفوظ ہوں،مگر اس لمحے اسے یاد نہیں آرہی تھیں۔ذہن پر اس قدر زور ڈالنے سے وہ تھک گیا تھا،اور اب اس کا ڈر کچھ کچھ کم ہوا تھا۔ادھر مرغ نے صبح کی اذان دی،ادھر اسے نیند آئی۔کچھ دیر کی نیند،اس پھٹی چادر کی طرح تھی،جس سے تن ڈھانپنے لگیں تو اور پھٹتی جائے۔سورج نکلنے سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔اسے لگا کوئی اس کا چہرہ نوچ رہا ہے،وہ خوف کی حالت میں اٹھ بیٹھا۔اس کا دوسالہ بیٹا،اس کے چہرے پر اپنے ننھے ہاتھ پھیر کر اسے جگا رہا تھا۔اس کی بیوی جلد جاگنے کی عادی تھی،جس کے ساتھ ہی بیٹا بھی جاگ پڑتا تھا۔اس نے وحشت کی نظر سے بیٹے کو دیکھا،اور ایک خوف کی حالت میں بچے کے منہ کو کھول کر دیکھا۔وہ اپنے خواب کی گرفت میں تھا۔ابھی ابھی اس نے دیکھا تھا کہ وہ کسی پرانی عمارت میں ہے۔اس کا ایک آدھ حصہ سلامت ہے،باقی سب کھنڈر ہے۔وہاں کچھ لوگ ہیں۔سب اجنبی ہیں۔وہ اکیلا ایک چھوٹی سی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ ایک عورت سامنے جا رہی ہے۔پیچھے ٹوٹی اینٹوں کے فرش پر اس کا بچہ پڑا ہے،اچانک بچہ روتا ہے تو وہ واپس آتی ہے،مگر یہ دیکھ کر سخت گھبرا جاتی ہے کہ بچہ اپنا ہی پاخانہ منہ میں ڈال رہا ہے۔یہ منظر دیکھ کر اسے ابکائی آنے لگتی ہے۔اسی دوران اسے لگتا ہے کہ کوئی اس کا منہ نوچ رہا ہے۔وہ اس خواب کو بالکل نہیں سمجھ سکا،بس ایک تیز سی،ٹکڑے ٹکڑے لہر اس کے تھکے ذہن میں تیر گئی کہ بچہ،بھیڑیا،عکس،پھٹی چادر.....

Scanned with CamScanner

تمھیں تو تاپ ہے، میرے لال؟ اس کی ماں اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
وہ اتنی دیر تک بستر میں پڑے رہنے کا عادی نہیں تھا۔ جب دن چڑھ آیا۔ ناشتے کے لیے اس کی بیوی دو تین مرتبہ اسے بلانے آئی تھی، مگر اسے بے سدھ پڑے دیکھ کر لوٹ گئی کہ شاید وہ نیند مین ہے۔ اس کی بیوی نے اپنی ساس سے یہ عادت جلد ہی سیکھ لی تھی کہ اپنے شوہر کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا۔ اس عادت کے نتیجے میں اس کے دل میں اپنے شوہر کی شخصیت کا اچھا خاصا رعب بیٹھ گیا تھا، اور وہ بے تکلفی سے بات کرنے سے ڈرنے لگی تھی، حالاں کہ اس نے میٹرک کیا ہوا تھا، اور اپنے سکول میں مقرر رہی تھی۔ صغریٰ نے ساس کو بتایا تو دونوں کو تشویش ہوئی۔ علی کی ماں دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی۔
اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کی ماں ڈر گئی۔

درد، بخار اور نیند کی ایک گولی دے دی ہے، شام تک ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن انھیں چاہیے کہ اپنی خوارک اچھی کریں، اور زیادہ سوچا نہ کریں۔ ڈاکٹر سلیم نے کہا، جو آرمی سے ریٹائرڈ ڈسپنسر تھے، اور ان کے والد کو بھی اکثر دیکھنے آیا کرتے تھے۔
ان کے باپ کو زیادہ پڑھنے کی بیماری تھی، اور انھیں زیادہ سوچنے کی بیماری لگ گئی ہے۔ ماں نے پریشان ہو کر کہا۔
بے بے جی، زیادہ سوچنا بیماری نہیں، لیکن اس سے کئی بیماریاں لگ سکتی ہیں۔ ڈاکٹر نے جیسے بڑے پتے کی بات کہی۔
میاں جی کے بعد ہی ان کی یہ حالت ہے۔ خود میں ان کے بعد بہت سوچنے لگی ہوں، علی اور اس کے بچے کے بارے میں۔ اللہ انھیں کم از کم دو بیٹے اور دے۔ علی کا کوئی بھائی نہیں، بیٹے تو زیادہ ہوں۔ ماں نے سخت فکر مندی سے کہا۔
اللہ خیر کرے گا۔ ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا۔
وہ شام تک سویا رہا۔ اٹھا تو کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر گھر کے وسیع صحن میں چلا پھرا۔

Scanned with CamScanner

بیٹے کو اٹھایا، اس سے توتلی زبان میں باتیں کرنے کی کوشش کی، اسے لگا جیسے اس کی زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ شاید نیند کی گولی کا اثر ہے۔ چائے کا ایک کپ منگوایا، اور بخشو کو قریبی گاؤں بھیجا، جہاں اس کا دوست شہزاد رہتا تھا، اور تحصیلدار کا بیٹا، اور اس کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ دونوں رات دیر تک تاش کھیلتے رہے۔

ایک زمیندار کا دماغ چل جائے تو اس کی زمینوں میں دوسروں کے ہل چلنے لگتے ہیں۔ آدھی رات کو بستر پر دراز ہوتے وقت اسے میاں حیات کی یہ بات شدت سے یاد آئی۔

میں کھیتوں میں خود ہل چلاؤں گا، اور وہ بھی بیلوں کے ساتھ۔ اس کے نوکر حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا، سائیں آپ نے کبھی ٹریکٹر سے ہل نہیں چلائے۔ بیلوں کو قابو میں رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے معلوم ہے۔ یہ کہہ کر اس نے سیاہ اور سفید دھاری دار بیلوں کی اس جوڑی کی باگیں پکڑیں، جسے صرف اس وقت پنجالی ڈالی جاتی تھی، جب ٹریکٹر خراب ہوتا تھا۔ دو ملازم اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ سائیں، انھیں چلانے کے لیے تین کام آنے ضروری ہیں۔ ہاں، ہاں مجھے معلوم ہے۔ تم ادھر جا کر بیٹھ جاؤ۔ علی نے انھیں ڈانٹا۔ سائیں سن تو لیں۔ اس کا ایک چہیتا نوکر بخشو بولا، جو اس کا تقریباً ہم عمر تھا، اور جس کا خاندان ان کا قدیمی نوکر چلا آتا تھا۔ اچھا بتاؤ۔ اس نے زور سے بیلوں کی باگیں کھینچیں۔ سیاہ بیل ڈکرا کر رکا، اور پیچھے کی طرف مڑا، جس سے ہل کی انی، بائیں جانب مڑ کر سفید بیل کے پاؤں سے ٹکرائی، اور اس نے غصے سے پاؤں پٹخا۔ دیکھا، سائیں، یہ جنور ڈھگے ہیں، انھیں قابو میں رکھنے کے لیے، طاقت نہیں چاہیے، ول ڈھنگ چاہیے۔ چلو، سمجھاؤ، ول ڈھنگ۔ علی ڈر گیا تھا، مگر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود کو بری طرح کام میں مصروف رکھے گا۔ سائیں، سب سے پہلے آپ کو باگوں کو کھینچنا اور ڈھیلا کرنا سیکھنا ہوگا۔ یہ ٹریکٹر کے سٹیرنگ سے زیادہ مشکل ہے۔ ان غریبوں کی ناک میں ہم باگ ڈالتے ہیں، ابھی آپ نے زور سے کھینچا تو بیچاروں کی جان نکل گئی۔ شکر ہے پنجالی تھی، ورنہ انھوں نے مڑ کر حملہ کر دینا تھا، یا بھاگ جانا تھا۔ دوسرا ان کی زبان سیکھنا ہوگی۔ بخشو نے کچھ ایسی آوازیں نکالیں، جسے وہ سنتا تو آیا تھا، مگر اسے دہرانا مشکل لگ رہا

Scanned with CamScanner

تھا۔ کچھ لفظ تھے، اور زیادہ تر آوازیں تھیں۔ ہ۔ل۔ااا۔ ہ۔ ہ۔ خ۔اا گ۔ گ۔ااا۔ شاوش اے کالیا۔ کھبے۔ ہ۔ل۔ااا۔ سجے۔ سوہنیا۔ اچھا اب تیسری بات بتاؤ میرے استاد۔ علی کو یہ سب دل چسپ لگنے لگا تھا۔ سائیں، آپ کو بائیں ہاتھ میں باگیں اور دائیں ہاتھ میں یہ چھمک رکھنی ہے۔ جہاں زبان اور باگ کام نہ کرے، وہاں چھمک کا استعمال کرنا ہے۔

اس نے الٹے سیدھے انداز میں آوازیں نکالیں (ادھر نوکر مسکرا رہے تھے)۔ اسے دو قدم کے بعد ہی اندازہ ہوا کہ سب سے مشکل کام ہل کی انی کو سیدھ میں رکھنا ہے۔ وہ کبھی باگ کو پیچھے کی طرف کھینچتا اور کبھی اسے زیادہ ڈھیلا کر دیتا، جس سے بیلوں کی رفتار میں ناہمواری پیدا ہو جاتی، اور ہل کی انی کبھی ادھر، کبھی ادھر ہو جاتی۔ اس نے جیسے تیسے اس بیگھے میں شمالاً جنوباً ٹیڑھی میڑھی سیینہ لگانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بیل خود بہ خود ایک چکر کاٹتے ہوئے، واپس جنوباً شمالاً چلنے لگے۔ ابھی وہ چند قدم چلا تھا کہ اسے لگا، کچھ لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ بخشو، شمسو اور مہامند ہیں، جو احتیاطاً اس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اس کی نظر سامنے پڑی تو تینوں اس جگہ موجود تھے، جہاں سے اس نے ہل کی ہتھی پکڑی تھی۔ وہ لرز گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میاں صاحب کے بعد کسی کو اپنے راز میں شریک نہیں کرے گا۔ اس نے عزم کیا کہ ہل چلاتا رہے گا۔ اس نے دیکھا کہ دائیں جانب بیل کے ساتھ ایک سایہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر بیلوں کو دائیں جانب موڑا۔ پہلے سایہ مزید دائیں جانب ہوا، اور پھر سایہ غائب ہو گیا۔ اسی وقت بخشو بھاگ کر آیا، اور چلایا۔ سائیں کیا کر رہے ہیں؟ کوئی ایک گھنٹے تک وہ گرتا پڑتا ہل چلاتا رہا۔ اس کے پاؤں مٹی سے لتھڑ گئے تھے، اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔

اگلے چند دن اس نے خود کو بری طرح مصروف رکھا۔ پہلے سب مویشیوں کے بارے میں ہر طرح کی معلومات حاصل کیں۔ وہ اپنے دو ملازموں کے ساتھ دن چڑھے باڑے میں گیا، جس کی دیوار اس بڑی حویلی سے ملتی تھی جہاں ٹریکٹر ٹرالی، ہل، کین، سہاگہ، تھریشر اور دوسرے زرعی آلات کھلے صحن میں موجود تھے۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کے والد نے کافی مویشی

Scanned with CamScanner

پالے ہوئے تھے، مگر ان کی صحیح تعداد اسے معلوم نہیں تھی۔ کبھی اس بات کی خواہش محسوس کی، نہ پروا کی تھی کہ کتنی گائیں، کتنی بھینسیں ہیں، کتنے بیل اور کتنے بچھڑے اور کٹے کٹیاں ہیں۔ اس نے پہلے گائیں دیکھیں۔ بیس تھیں۔ ساہیوال نسل اور نیلی بار کی تھیں۔ پچیس بھینسیں اور دس بچھڑے اور آٹھ کٹے کٹیاں تھیں۔ بیلوں کی تین جوڑیاں تھیں۔ اس نے کالے رنگ کی ساہیوال نسل کی ایک گائے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے تیزی سے دم ہلا کر ہلکی سی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس نے دیکھا کہ باڑے میں سب سے خوبصورت مخلوق بچھڑے تھے، جن کی عمریں دو سے چار ماہ تک کی تھیں۔ اسے بھینسوں سے البتہ وحشت محسوس ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ باڑے میں گوبر کی بو پھیلی تھی، مگر ناندوں میں تازہ کٹے چارے کی مہک سے ملنے کے سبب، اس کی ناگواری کم ہوگئی تھی۔ اس نے گایوں اور بھینسوں کے دودھ کی مقدار پوچھی۔ اسے بتایا گیا کہ نو گائیں اور سات بھینسیں دودھ دیتی ہیں، تقریباً سو کلوگرام دودھ روزانہ دوہا جاتا ہے۔ بیس کلو گھر کے لیے ہے، اور باقی بیچ دیا جاتا ہے۔ اس نے منشی سے کہا کہ اسے دودھ اور فصلوں کا سارا حساب دکھائے۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ باڑے سے نکل کر ڈیرے پر آ گیا تھا۔ وہ اسی بڑی کرسی کے پاس پڑی چھوٹی کرسی پر بیٹھا تھا جہاں اس کے والد بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ آدمیوں کی طرح چیزیں بھی جانے والوں کی کمی محسوس کرتی ہیں۔ جس طرح آدمی کے دل میں جانے والوں کی کمی محسوس کر کے گھاؤ لگتا ہے، اسی طرح چیزوں کا سینہ بھی چرجایا کرتا ہے۔ آدمی کا تعلق گھر کے پرندوں، جانوروں، درختوں ہی سے نہیں، چیزوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی والدہ بار بار ذکر کرتی تھیں کہ گھر کے پلنگ پر اس نے کئی بار میاں جی کو دیکھا ہے، اور خود اس نے ایک بار انھیں دیکھا تھا، اور بے اختیار ہو کر وہ اس پلنگ پر بیٹھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد اسے ابا کی کرسی پر بیٹھنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ پلنگ کی طرح ابا کی بڑی کرسی پر رکھے گدے کا غلاف تبدیل کیا جاتا تھا۔ وہاں پڑی کتابوں سے گرد جھاڑی جاتی تھی۔ صندوق والے واقعے کے بعد تو اس کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا۔ تاہم اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے والد کرسی پر بیٹھے اس کی ایک ایک بات کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ بہت کم والد کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد تعلیم ترک کر دی تھی،

اور گھر ہی رہتا تھا۔ زیادہ وقت وہ گھر سے باہر گزارتا تھا۔ اسے تاش کھیلنے کا بے حد شوق تھا، اور شاید ہی کوئی دن گزرا ہو، جب اس نے تاش نہ کھیلی ہو۔ اور شاید ہی کوئی دن گزرا ہو، جب اس کی لڑائی نہ ہوئی ہو۔ اس سے اس کے دوست کم ہونے لگے تھے۔ بس دو تین دوست تھے، جن کے ساتھ وہ دن کا زیادہ حصہ گزارتا۔ اسے اپنی ہار اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ تاش میں اسے شکست دینے والا، اپنا دشمن محسوس ہوتا تھا۔ ہر شام جب وہ گھر پہنچتا تو لگتا کہ کوئی نہ کوئی نیا دشمن بھی اس کے ساتھ ہے، جسے وہ گالیاں دے رہا ہے، اور جس کا گلا دبانے کی وہ کوشش کر رہا ہے۔ اس کے والد اس سے پوچھتے کہ تم اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں رہتے ہو؟ تم نے اتنے اچھے اداروں میں تعلیم حاصل کی، مگر؟؟ اسے یہ بات بھی اپنی توہین محسوس ہوتی، مگر اسے والد سے کبھی اونچی آواز میں بھی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بیوی سے وہ جھگڑ لیتا تھا۔

منشی بھی کھاتہ لے کر موڑھے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہی کہا، آج تو آپ بالکل اپنے میاں جی کی طرح لگ رہے ہیں۔ وہ مسکرا دیا۔ منشی جی، مجھے سارا حساب دکھایئے۔ کتنے ایکڑ گندم کاشت ہوئی، بیج سے لے کر ڈیزل کے خرچ تک، اور ملازموں کی تنخواہوں سے کیڑے مار ادویات پر اٹھنے والے خرچ کا حساب۔ ملازموں کو بلا کر پوچھا کہ کیا انھیں اتنے ہی پیسے ملے، جتنے بھی کھاتے میں درج تھے۔ خود جمع تفریق، ضرب تقسیم کی۔ ایک جگہ گڑبڑ تھی۔ ٹیوب ویل کے لیے منگوائے گئے ڈیزل کے ریٹ کافی زیادہ درج تھے۔ ایک جگہ آٹھ روپے لیٹر تھا، مگر دوسری جگہ دس روپے۔ کم از کم دو ہزار روپے کی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ 'منشی صاحب، کیا آپ کو خدا کا خوف نہیں'۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ منشی صاحب کا گنجا سر جھکا ہوا تھا، جس سے اس کی سفید ڈاڑھی مزید بے ترتیب لگ رہی تھی۔ 'یہ کب سے کر رہے ہیں؟' اس کے جواب میں بھی خاموشی ملی، مگر اسی لمحے بخشو بول پڑا۔ 'سائیں، جب تک بڑے سائیں تھے، کسی کو یہ ہمت نہیں تھی۔ آپ ان کی گدی سنبھالیں نا'۔ منشی نے بخشو کی طرف التجا کے انداز میں دیکھا۔ 'منشی صاحب، آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے'۔ یہ بات دراصل اس نے اس چھوٹے سے مسئلے کو ختم کرنے کی خاطر کہی۔ اس نے ایک خیال کی تیز لہر کو تھوڑی دیر پہلے محسوس کیا تھا، جس کے مقابل منشی کا معاملہ

Scanned with CamScanner

بے حد معمولی محسوس ہوا تھا۔ 'یہ تو ایک طلسم ہے، واقعی ایک جادو، ایک زبردست چیز ہے' اس نے جیسے خود سے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ منشی کی طلسمی، اس طلسم کے سامنے بالکل معمولی تھی، جس کا تعلق ہندسوں سے تھا، اور اس پر ٹھیک اس وقت ظاہر ہوا تھا، جب وہ انھیں ضرب دے رہا تھا، تقسیم کے عمل سے گزار رہا تھا، اور انھیں کم یا زیادہ کر رہا تھا۔ یہ بڑھتے تھے، گھٹتے تھے، مگر مستقل بھی رہتے تھے، اور اسے ایک انوکھا کھیل محسوس ہوتے تھے۔ بہ ظاہر وہ کاغذ پر، اس کے ہاتھ میں پکڑی پنسل سے ظہور کرتے تھے، لیکن ایک طرف اخلاقی دنیا میں فیصلہ کن دخل دیتے تھے، اور دوسری طرف اس دولت کو گھٹاتے بڑھاتے تھے، جو وہاں سے دور کسی محفوظ جگہ موجود تھی۔ خدا جانے موجود تھی بھی کہ نہیں۔ بس ان ہندسوں سے اس کے وجود وعدم کی خبر ہوتی تھی۔ کاغذ پر ظاہر ہونے والے ہندسے اس کی، اور اس کے اردگرد لوگوں کی زندگی پر کس شدت سے اثر انداز ہونے کی طاقت کے حامل ہو گئے تھے۔ یہ ہندسے، اب تک معزز سمجھے جانے والے سفید داڑھی اور گنجے سر والے شخص کو رسوا کر سکتے ہیں۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ یہ کیسا طلسم ہے کہ ایک ہندسہ کسی کی اخلاقی حیثیت کا فیصلہ کر سکتا ہے، اسے نفرت کا موجب بنا سکتا ہے، یا تحسین وتعریف کا، کسی سے اس کے بچوں کا رزق چھین سکتا ہے، کسی کا رزق کسی اور کو دے سکتا ہے۔ یہ کیسا بے ہودہ جادوئی عمل ہے کہ چند ہندسے مل کر اسے یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ ایک طاقت ور شخص ہے، وہ جسے چاہے خرید سکتا ہے، جسے چاہے ذلیل کر سکتا ہے۔ اسے بچپن کی سنی کہانیوں کا وہ طوطا یاد آیا جس میں دیو کی جان ہوا کرتی تھی۔ تب اسے یہ بات کافی عجیب لگتی تھی کہ اتنے بڑے، اتنے ہیبت ناک دیو کی جان ایک معمولی سے طوطے میں کیسے ہو سکتی ہے، پھر دیو اور طوطے کا آپس میں تعلق ہی کیا ہے؟ پر آج اسے سمجھ آیا کہ دیو کون تھا اور طوطا کون۔ اسے طوطے کی چونچ کا خیال کرتے ہی کچھ ہندسے یاد آنے لگے۔ دیکھنے میں ایک بے ضرر شے، کس قدر ظالم، کتنے دہشت انگیز وجود کو اپنی مٹھی میں رکھ سکتی ہے !چیزوں کے آپسی تعلقات کس قدر انوکھے اور چکرا دینے والے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ اسے سکول کے زمانے میں الجبرا بہت پسند تھا۔ وہ ریڈیو سنتے ہوئے الجبرا کے سوال نہایت شوق سے حل کیا کرتا تھا۔ مگر جس طلسم کو اس نے آج دریافت کیا، وہ نئی چیز تھی! وہ اس نئی

دریافت کی خوشی محسوس کرر ہا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک سوال یوں پیدا ہوا، جیسے تیز رفتار گاڑی کے آگے، اچانک ایک موڑ آجائے: سفید حساب کی کاپی پر لکھے ہندسے اور آئنے میں دکھائی دینے والے عکس میں کوئی تعلق ہے؟ اس سوال کے ظاہر ہوتے ہی، اسے لگا جیسے اس کی ساری محنت اکارت گئی۔ اسے لگا، یہ سوال نہیں تھا، ایک ایسے سچ کا اظہار تھا جس سے بچنے کی وہ کوشش میں دن رات ایک کیے ہوئے تھا (یہ کیسا ظالم سچ تھا جس کی طاغوتی قوت اسے بے دست و پا کیے دے رہی تھی، وہ یہ سوچ کر دکھی ہو گیا تھا)۔ اس نے اس کوشش کا آغاز بچپن کے ایک عام سے تجربے کی روشنی میں کیا تھا کہ وہ جب لڈو یا کیرم کھیلنے سے اکتا تا تھا تو تیز دوڑ لگایا کرتا تھا، یا کرکٹ کھیلنے لگتا تھا۔ اس کے دل میں اس یقین نے گھر کر رکھا تھا کہ جس کھیل میں دماغ پریشان ہو جائے، اسے چھوڑ کر جسم کو تھکا دینے والا کھیل شروع کرنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ جس کام کو اس نے کبھی ہاتھ لگانے کا نہیں سوچا تھا، اسی کو پوری رغبت اور خلوص سے کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اور اس وقت وہ بہت خوش ہوتا تھا، جب اسے پسینہ آتا تھا۔ اسے حساب کا خیال نہ آتا اگر وہ باڑے میں موجود جانوروں کو نہ گنتا۔ چیزیں کس طرح ایک دوسرے سے بندھی ہوتی ہیں، یا ہم جیسے ان کی طرف بڑھتے ہیں تو آپس میں بندھتی چلی جاتی ہیں۔ چیزوں کے باہمی رشتے کہاں ہوتے ہیں؟ خود چیزوں میں، ہمارے اندر یا ہمارے چھوٹے موٹے فیصلوں میں، یا کسی دوسری دنیا میں، جس کی طرف جانے سے ہم ڈرتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایک جانور کو دیکھنا، بس اسی کو دیکھنا ہے، اس کو گننا بس ایک جانور کو گننا ہے اور بس، مگر تھوڑی دیر بعد کھلتا ہے کہ یہ تو بھول بھلیاں ہیں۔ جانور، ہندسہ صندوق، آئنہ، عکس، ابا، ان میں تعلق کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟ یہ تعلق اسے کس دنیا کی طرف لے جا رہا ہے؟ اس نے منشی اور بخشو دونوں کو جانے کے لیے کہا، اور خود اپنے والد کی کرسی کے ہاتھ کو پکڑا۔ وہ جیسے رو دینے کو تھا!

اسے لگا کوئی اس کے کاندھے کو پکڑ کر کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کا دل مزید بھر آیا۔ مجھے کس جرم، کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟ اس نے یہ سوال اپنے طور پر آنے والے سے کیا، مگر فوراً اسے محسوس ہوا کہ اس سوال کی گونج ایک قدیمی عمارت میں گونجنے لگی ہے، جس میں وہ کئی دنوں سے بھٹک رہا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی وہ سہم گیا۔ اس نے ایک بچے کی مانند سمٹنے کی کوشش کی۔ آنکھیں بند کرنے اور سونے

کی کوشش....مگر یہ کوشش ہی اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی تھی۔اس نے دیکھا کہ اس عمارت کے ہر کمرے کا دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا ہے۔ایک، دو، پانچ، بیس۔ابھی آگے جانے کتنے کمرے ہیں؟ ہر قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں اکیلا نہیں، لیکن اور کون یہاں موجود ہے، اس کا علم نہیں ہو پاتا۔کسی کا کوئی سایہ ہے، نہ پرچھائیں، صرف ایک یقین ہے کہ کئی لوگ یہاں ہیں۔شاید اس سے اگلے کمرے میں، شاید اس سے اگلے کمرے میں ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں، یا شاید اس کے پیچھے، اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔اسے برابر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے۔کب، کس وقت، کس کے ساتھ، اس کا جواب اسے معلوم نہیں تھا۔عجیب بات یہ تھی اسے اس کا جواب معلوم کرنے کی خاص آرزو بھی نہیں تھی۔وہ سہما ہوا بس بھٹک رہا ہے۔

اس نے دیکھا کہ اس کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، جو نامعلوم کب سے اس کا دایاں کاندھا پکڑے کھڑی تھی۔وہ ماں کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رو پڑا۔ماں کے آنسو تھم گئے۔ چپ ہو جا، میرے لال، سب کو جانا ہے۔پر میاں جی گئے کب ہیں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ تمھارے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے، جب تم کرسی کا ہاتھ پکڑے کسی گناہ کا ذکر کر رہے تھے۔ میرے لال ہم سب گناہ گار ہیں، پر یہ سوال کرنا اچھا نہیں۔اس نے آنسو پونچھے اور کہا: اماں جی، آپ نے کبھی ابا کا صندوق کھول کر دیکھا تھا؟ نہیں میرے لال، انھوں نے کہا تھا اسے میرا اکلوتا پتر ہی کھولے گا۔اللہ جانے باپ بیٹے میں کیا راز تھا؟ اس نے دیکھا کہ اماں جی کچھ پریشان ہوئی ہیں۔ تمھیں کوئی شک ہے کہ میں نے کھولا ہے؟ نہیں نہیں اماں جی، میں نے بس ویسے ہی پوچھا، مجھے ابا بہت یاد آتے ہیں۔

تم اپنے ابا کی چھوڑی ہوئی کتابیں پڑھا کرو، وہ بھی جب پریشان ہوتے تھے، کئی کئی گھنٹے کتابیں پڑھتے تھے۔اماں نے جیسے حل بتایا۔وہ جاتے جاتے رکیں۔اس کے چہرے کو ایک بار پھر سہلایا، اور کہا: تیرے ابا کو چٹی داڑھی اچھی لگتی تھی، تمھیں یہ کالی داڑھی اچھی نہیں لگتی۔میں بخشو سے کہتی ہوں کہ شہامند نائی کو بلا لائے۔

Scanned with CamScanner

اس رات کے آخری پہر تک شاید ہی اس کی آنکھ لگی ہو۔ شروع شروع میں اسے نیند نہ آنے سے بے حد الجھن اور وحشت سی ہونے لگتی تھی، کچھ کچھ غصہ بھی آتا تھا، جس کا اظہار وہ صبح اپنی بیوی سے یہ کہہ کر کیا کرتا تھا کہ وہ اس کی ذرا پروا نہیں کرتی، وہ کسی رات مر جائے گا مگر وہ یوں ہی بھینس کی طرح بے خبر ڈکراتی پڑی رہے گی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے غصے میں باقاعدہ حسد شامل ہے۔ کیسے آدمی اپنوں اور اپنے قریب رہنے والوں کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں سے حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ خیال کر کے وہ خود سے گھن محسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے نیند کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، اور اس سے فرق پڑا۔ کسی وقت نیند آ بھی جاتی، مگر اس کا زیادہ وقت سوچنے میں گزرتا۔ اسے لگتا جیسے اس کے اندر ایک چکی مسلسل چل رہی ہے۔ وہ باقاعدہ گھرڑ گھرڑ کی آواز سنتا۔ یہ آواز کھوپڑی سے کانوں کی طرف آتی محسوس ہوتی۔ ساون کی اس رات کو بھی چکی چل رہی تھی۔ اس کی کھوپڑی بری طرح سنسنا رہی تھی۔ وہ کون تھے؟ ان کا مجھ سے کیا تعلق تھا؟ وہ کہاں سے آئے تھے؟ شاید ہی کوئی لمحہ ہو، جب اس نے ان سوالوں کی نوک اپنے اندر محسوس نہ کی ہو۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ کانٹوں کی باڑھ میں الجھ گیا ہے۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ ایک پورا جتھا آنکھوں پر سیاہ ڈھاٹے باندھے، بھالے لیے اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے پاس بس ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق سے لڑے، جسے وہ پہچانتا تک نہیں۔ اس وقت اس کی بے بسی کی انتہا ہو جاتی، جب وہ اسے پہچاننا چاہتا مگر خود کو اس مخلوق سے جنگ کرنے پر مجبور پاتا۔

وہ اس لمحے کو دوبارہ لانے کی کوشش کر رہا تھا جس کا سامنا اس نے آئنے میں کیا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ ان میں ایک عکس عورت کا تھا۔ وہ کون تھی؟ چکی تیز چلی مگر خالی، کچھ برآمد نہ ہوا۔ اس نے ان تمام عورتوں کے بارے میں سوچا جو اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ پہلی عورت کون تھی؟ ......اس کے ماموں کی سالی کی بیٹی تھی.....دس سال کی ہوگی.....مگر وہ عورت تھوڑی تھی...وہ کسی شادی پر اکٹھے تھے.....وہ آم چوس رہا تھا۔ اس نے شوخی سے کہا تھا، ایک آم مجھے بھی لے دو۔ اس نے آدھا چوسا ہوا آم اس کی طرف بڑھایا۔ یہ لو۔ اس نے بے دھڑک لے لیا، اور اسے چوسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے بٹ بٹ تکنے لگا تھا۔ بس یہ واقعہ اب تک اسی طرح اس کے ذہن سے

Scanned with CamScanner

چپکا ہوا تھا جیسے .....جیسے.....کچھ اور باتیں ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن سے چپک گئی تھیں ۔اظہر اس کا ہم جماعت تھا ۔ایک سال پہلے اس کے والد نے اسی موضع میں ڈھائی تین مربعے ٹھیکے پر لیے تھے ۔تب اسے سکول میں داخل ہوئے تین چار ماہ ہوئے تھے ،جب پورے سکول میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ اظہر اس کا عاشق ہے ۔وہ دونوں پانچویں کلاس میں تھے ۔ چھ لڑکوں کے ایک گروپ نے پوچھا ،اظہر اگر علی تم سے کچھ مانگے تو دو گے؟ اس نے بغیر توقف کے کہا ،سب کچھ ،اور انھی شیطانوں نے کہا: 'وہ بھی' اور اس نے کہا ،ہمیشہ کے لیے! یہ سب سوچتے ہوئے ،اسے اپنے سکول کی عمارت پر لکھی ہوئی ایک عبارت یاد آ گئی۔ 'یہ سکول ریاست ہائے متحدہ امریکا کی امداد سے تعمیر ہوا' ۔ یہ عبارت بھی اس کے ذہن سے چپکی ہوئی تھی ۔شاید وہ ان تینوں کے تعلق پر غور کرتا کہ اس کی چکی کو پینے کے لیے مسلسل کچھ نہ کچھ چاہیے تھا ،مگر فوراً اسے کچھ اور چہرے یاد آنے لگے ۔اسے عشرت یاد آئی ۔ وہ لمحہ اچانک زندہ ہو کر اس کے سامنے آ گیا ۔اب چکی کی جگہ فلم سی چلنے لگی ۔ بدن ایک ساز ہے ۔اس ساز پر انگلی پہلی بار پڑتی ہے ۔ساز میں کھنچاؤ ،کساؤ ،گریز ،سپردگی پیدا ہوتی ہے ، خود انگلی میں خون کی رفتار بڑھ جاتی ہے ۔کسی اور دنیا کی موسیقی پہلی بار بدن سنتے ہیں ،بدن خود اپنی دنیا سے پہلی بار آگاہ ہوتے ہیں ۔ بدن ،ایک عالم سرمستی میں جاننے لگتے ہیں کہ بدن کے ساز کے سیکڑوں تار ہیں ۔ ہر تار میں ایک نیا سر ہے ۔ نئے سر کا اپنا رس ہے ۔اس رس میں زندگی کا سب سے غیر معمولی تجربہ ہے ۔ بدن کے تار کو چھیڑنا .....ایک عظیم فن ہے ...وہ دونوں عجلت میں تھے ۔عجلت نے پہلی بار اس فن کو رونما نہ ہونے دیا .....اس نے جلد ہی راز پالیا کہ عجلت کے علاوہ زیادہ سوچنے سے بھی یہ فن برباد ہوتا ہے ....تم پوروں سے مٹی کو چھوتے ہو ...مٹی سانپ کی مانند حرکت میں آتی ہے ....پھر سانپ بن جاتی ہے .....ایک اور دنیا سے ہلکی ،نرم آوازیں سنائی دیتی ہیں .... عشرت ....جیسے فلم کا ایک فریم ٹھہر گیا ہو ....وہ اٹھا ۔دوسرے کمرے میں گیا ۔ پندرہ منٹ بعد واپس آیا ۔ 'عجلت اور سوچنے کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی اس فن کو برباد کرتی ہے ،کسی اور کی یاد' ۔اس نے جیسے خود سے کہا ۔

Scanned with CamScanner

وہ جب شہر پہنچا ہے تو شام ہو رہی تھی۔ ہوٹل میں سامان رکھا، کچھ دیر بیڈ پر ستایا، اور پھر پیدل ہی باہر نکل پڑا۔

گزشتہ دس سالوں میں یہ شہر کتنا بدل گیا ہے۔ گاڑیاں بڑھ گئی ہیں۔ شور بڑھ گیا ہے۔ دھواں، گرد بڑھ گئے ہیں۔ لوگ جانے کہاں کہاں سے آگئے ہیں۔ کہیں کی مٹی، کہیں کا روڑا یہاں نظر آنے لگا ہے۔ ڈاڑھیوں اور پگڑیوں والے بڑھ گئے ہیں۔ جوتے پالش کرنے سے لے کر رکشوں، ہوٹلوں، ڈرائی فروٹ، لنڈے کے کپڑوں کی دکانوں پر وہی نظر آتے ہیں۔ خود اس کے گاؤں میں لکڑی کے تین ٹال انھی ڈاڑھی والوں کے ہیں، جن کی عورتیں ٹوپی والے برقعے کرتی ہیں، اور بچے کام کرتے ہیں۔ اس شہر کے پردیسیوں کو ایک دوسرے سے وحشت تو ہوتی ہوگی، اور اپنی وحشت مٹانے کے لیے، ایک دوسرے پر چلاتے، ایک دوسرے کو انگارہ آنکھوں سے دیکھتے ہوں گے، اور اپنی اجنبیت کو مزید بڑھا لیتے ہوں گے۔ ہر سڑک بازار بنتی جا رہی ہے، اور ہر گھر میں سے ایک دکان نمودار ہوتی جا رہی ہے، یا شاید ہر دکان کے پیچھے گھر نما کوئی چیز نظر آنے لگی ہے۔ ہر دوسرے قدم پر ٹکا ٹک ہو رہی ہے۔ لگتا ہے لوگوں کو الا بلا خریدنے اور الم غلم کھانے کے سوا کسی شے سے دل چسپی نہیں رہی۔ شاید لوگوں کے پیٹ، ان کے سروں میں گھس گئے ہیں، جیسے گھروں میں دکانیں گھس گئی ہیں، یا دکانوں میں گھر پھنس کر رہ گئے ہیں۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ سوچے چلا جا رہا تھا۔ دس سال پہلے کی کوئی نشانی؟ جھکڑ سے بچا کوئی تنکا؟ اس نے جیسے پورے شہر سے یہ سوال پوچھا۔ چند قدم چلا ہی تھا کہ اسے سوال کا جواب مل گیا۔ اسے کچھ عمارتیں نظر آئیں۔ اس کی روح میں جیسے روشنی کا ایک اچانک جھما کا ہوا ہو۔ یہی چند ایک پرانی عمارتیں ہیں جو مجھے یاد دلاتی ہیں کہ ہاں یہ وہی شہر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ پرانے شہر کی یاد دلانے کے علاوہ بھی ایک کام یہ عمارتیں کرتی ہیں، اس دنیا کو زندہ رکھتی ہیں، جو اس شہر میں رہنے بسنے سے آدمی کے دل کے ایک نامعلوم سے گوشے میں آباد ہو جاتی ہے؛ جیسے دل میں ایک نیا طاقچہ سا نمودار ہو جاتا ہے، اور ایک دیا سا جلنے لگتا ہے، اور اس کی روشنی ان دیاؤں کی طرف دھیان دلاتی ہے جو بجھ گئیں، مٹ گئیں، دفن ہو گئیں، مگر جن کو یاد کرنے سے ایک یقین سا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس موت کو شکست دینے

Scanned with CamScanner

کی صلاحیت آخری سانس تک باقی رہتی ہے۔اس نے دیکھا کہ دائیں طرف سفید مسجد اسی طرح موجود ہے۔ وہ اس مسجد میں بس ایک مرتبہ جمعہ پڑھنے گیا تھا،مگر اسے اس نے سیکڑوں مرتبہ دیکھا تھا،اور مدت بعد جب وہ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے سامان سفر میں جو چیزیں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، ان میں ایک یہ مسجد بھی تھی۔اس روز اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ یہ ٹھیک ٹھیک سمجھنے قاصر ہے کہ اس عمارت سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ مسجد سے ذرا آگے آیا تو بائیں طرف گلی کی نکڑ پر سرخ گرجا اور اس پر صلیب کا نشان نظر آیا۔وہ ایک مرتبہ اس کے اندر بھی گیا تھا؛ کچھ تجسس کی خاطر، اور کچھ اس سوال کے جواب کی تلاش میں کہ کیا وہاں بھی وہی خدا ہے،جس کا احساس وہ مسجد میں کرتا ہے؟ اسے یاد آیا جب اس نے اپنے دوست عارف سے ذکر کیا تھا تو وہ پہلے تو اس کی سادگی پر ہنسا تھا، پھر سنجیدہ ہو کر ڈانٹ دیا تھا کہ ایسے سوالات آدمی کو کافر بنا دیتے ہیں۔اس نے ہنس کر کہا تھا، اچھا کافر بننا اس قدر آسان ہے؟ اگر ایسا ہے تو آؤ ذرا کچھ دیر کافر بن کر دیکھیں کہ کافر کو زندگی کیسی نظر آتی ہے۔ وہ دونوں اندر گئے۔اسے یاد آیا،سب سے بڑی الجھن تو اس بات پر محسوس ہوئی تھی کہ جوتوں سمیت وہ گرجا کے اندر آئے تھے۔اسے کافی دیر اس کش مکش سے گزرنا پڑا تھا کہ ایک عبادت گاہ میں جوتوں سمیت کیسے آدمی جا سکتا ہے؟ خیر، جیسے تیسے وہ کچھ دیر بنچ پر بیٹھا تھا۔ پہلے لمحے تو یوں لگا جیسے وہ کلاس روم میں آ گیا ہے۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کلاس روم تو سارے کے سارے گرجوں کے اندر کے ماحول کی نقل لگتے ہیں۔اس نے پھر آنکھیں بند کی تھیں، مگر اس نے پوری دیانت داری سے محسوس کیا تھا کہ اس نے وہاں ایک اسرار آمیز، نیم وحشت ناک تقدس کی ایک کیفیت تو محسوس کی تھی، مگر کسی اور کیفیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔اس نے پوری سچائی سے، خود سے اعتراف کیا کہ وہ کبھی خدا کو محسوس کرنے کے تجربے سے گزرا ہی نہیں تھا۔ ذہن پر کافی دیر زور دینے کے باوجود یہ محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا کہ مسجد میں خدا کا احساس کس قسم کا ہوتا ہے؟

وہ جب باہر نکل رہا تھا تو اس نے عارف سے کہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم، خدا کہاں رہتا ہے، مسجد، مندر یا گرجے، گوردوارے میں، مگر ایک بات آج مجھے پتا چلی ہے کہ عمارتیں خدا کو قید کرنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ 'تم نے واقعی کافر بننے کا ارادہ کر لیا ہے' عارف نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

کہا۔'ابھی میری پوری بات سنو۔ کیا یہ آدمی کی جسارت نہیں کہ وہ خدا کو قید کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ ویسے اس جسارت سے آدمی اپنے اس غرور کی حفاظت کرتا ہے، جو خدا کو ماننے سے خاک میں ملتا محسوس ہوتا ہے'۔ 'خدا سے ڈرو، علی۔ ایسی باتیں منہ سے نکالنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچتے ہیں'۔ عارف نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'یار پوری بات تو سنو، تم مولوی، پادری، پنڈت بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمھیں یاد ہے، ایک بار... شاید سر غلام رسول نے کہا تھا کہ ہم سب دائرے کے اندر ہیں، اور خدا اس دائرے سے باہر ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ یہی نا کہ ہم قید میں ہیں، اور خدا کو بھی قید کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے چھوٹے سے دائرے میں، اپنے معمولی سے تصور میں اس خدا کو لانا چاہتے ہیں، جو اس سے باہر اور ماورا ہے'۔ نوجوانی کے دن بھی کیسے انوکھے تھے، ہر بات سوچنے اور کہنے کی ایک ایسی آزادی تھی، جو کسی کی دی ہوئی نہ تھی، یا شاید کسی کے دیے ہونے میں یقین نہ رکھتی تھی! وہ ان باتوں کو یاد کرتے ہوئے، ایک عجب سی سرشاری محسوس کر رہا تھا۔ ذرا آگے بڑھا اور گرجے کے قریب پہنچا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہاں یہ شہر واقعی بہت بدل گیا ہے۔ گرجے کا دروازہ آدھا جلا ہوا تھا۔ وہ جس گاؤں سے آیا تھا وہاں چند سال پہلے وہ مسجد جلائی گئی تھی، جس میں اس نے نوجوانی تک عید کی سب نمازیں پڑھی تھیں۔ جس وقت اس نے یہ خبر سنی تھی، اسے لگا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے کلیجے کو چبا ڈالا ہو۔ اس میں شدید رنج اور غصہ بھر گیا تھا، اور اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں، اور زبان جیسے تلوار بن گئی تھی۔ مسجد کو آگ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جس بات کا کسی کو خیال تک نہ آئے، جس عمل کو سوچتے ہوئے آدمی کے ذہن کے پھٹنے کا اندیشہ ہو، جو ممکنات سے باہر ہو، اور جس کو ممکنات میں لانے کی کوشش سے ناقابل یقین دہشت، ایک تصور سے باہر پھٹکار ہر سو چھانے کا یقین ہو، وہ سب ہو جائے تو...... لیکن وہ سب ہوا۔ پورے گاؤں میں شدید غصہ اور رنج پیدا ہوا۔ انھی دنوں دوسری مسجد جس پر سیاہ علم لہراتا تھا، پولیس کا پہرہ بٹھایا گیا، اور اس کے والد سمیت باقی بزرگوں کو یقین دلایا گیا کہ وہ سب کسی کافر نے کیا تھا، اور اسی کافر نے دو ماہ پہلے شہر کی اس امام بارگاہ کو آگ لگائی تھی، جس میں دو عورتوں سمیت ایک بچہ بھی جان سے گیا تھا۔ اس کے بعد ان کے گاؤں کے دو حصے بن گئے تھے۔ اسی برس جب بائیس رجب آیا تو پہلی بار خودان کے گھر میں صبح کاذب کے وقت امام جعفر صادق کی نیاز کا اہتمام ہوا، نہ وہ

نیاز کھانے کے لیے میاں حیات کے گھر گئے۔ اس نے یاد کیا کہ اگر چہ اس نے عید کے علاوہ شاید ہی کوئی نماز پڑھی ہو مگر اسے لگا تھا مسجد کو جلانے کے واقعے نے اسے بدترین حالت سے دوچار کیا تھا۔ وہ اس رات سو نہیں سکا تھا۔ اس نے بچپن میں قرآن کا درس اسی مسجد میں لیا تھا۔ اسے مسجد کے اندر موجود وہ سب چیزیں شدت سے یاد آئیں، اور ان کی باس بھی محسوس ہوئی تھی، جنھیں وہ بچپن میں دیکھ کر مرعوبیت، ڈر، احتیاط، دھیان اور خاموشی کی ایک ملی جلی عجب حالت محسوس کیا کرتا تھا، جسے کالج میں کہیں پہنچ کر اس نے تقدس کے لفظ سے پہچانا۔ مسجد کی صفیں، پہلی صف پر چند جا نمازیں، محراب، منبر، الماریوں میں پڑے غلافوں میں لپٹے قرآن اور سپارے، اور دائیں بائیں دونوں دیواروں میں طاق، جہاں سرسوں کے تیل سے مٹی کے دیے جلائے جاتے تھے، اور جلے ہوئے تیل کی ایک بوجھل مگر دل پر غلبہ کرتی باس محسوس ہوتی تھی۔ اور اور خدا بھی تو تھا مسجد میں؟ آگ، خدا؟ یا خدا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ خیال کر کے تو اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ یا تو مسجد میں خدا نہیں تھا، یا پھر اسے مسجد کی پروا نہیں تھی، یا اسے مسجد کو جلانا ایسے ہی لگا ہوگا جیسے ایک بچے نے دوسرے بچے کا کاغذ کا گھر جلا دیا ہو۔ اس کا مطلب ہوا، خدا کو غصہ نہیں آتا جیسے بچے کو آتا ہے۔ خدا نے سارا غصہ بندوں کو دے دیا ہے، واہ میرے خدا! میرے تماشا گر! خدا کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ایک عجیب آزادی کا احساس ہوا تھا۔ جس خدا نے اپنے گھر کو جلانے والے کا ہاتھ نہیں پکڑا، وہ میرے خیالات کا محاسبہ کیوں کر کرے گا؟ لیکن اس شخص کا محاسبہ ضروری ہے جس نے یہ بھیانک عمل کیا۔ اس نے بار بار اس شخص کے بارے میں سوچا جس نے پٹرول چھڑک کر ماچس کی تیلی اس پر پھینکی تھی۔ اس نے اس شخص کا چہرہ ذہن میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیسا ہوگا؟ ناممکن کو بھیانک انداز میں ممکن بنانے والے کا چہرہ کیسا ہوتا ہے یا کیسا ہو جاتا ہے؟ اس کا چہرہ آدمی جیسا نہیں ہوسکتا۔ آدمیوں کی دنیا میں بھیانک پن کو کسی بدروح کی طرح شامل کرنے والا، آدمی کی جون میں کیسے رہ سکتا ہے؟ آدمی بھیڑیا بن سکتا ہے، آدمی کے جسم کو چیر پھاڑ سکتا ہے، روح پر ضرب لگا سکتا ہے، مگر آدمی کے خیال سے باہر کی بھیانک ہولناکی پیدا کر کے، وہ آدمی ہوسکتا ہے نہ آدمی کی سمجھ میں آنے والا بھیڑیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ہستی کی ایک بڑی الجھن کی پیدا کردہ دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اس نے یاد کیا، پہلی بار میں نے ایک قاتل کو اپنے ڈیرے پر دیکھا

Scanned with CamScanner

تھا، جو کچھ لوگوں کے ساتھ ابا کے پاس آیا تھا، اسے مقتول کے والدین نے ایک لڑکی کے رشتے اور ایک مربع زمین کے بدلے معاف کر دیا تھا۔ ابا نے ان کے راضی نامے پر دستخط کیے تھے۔ اس کا چہرہ بالکل ایک عام انسان کا چہرہ تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ ایک قاتل عام انسان تو نہیں رہ جاتا۔ موت خدائی اختیار ہے۔ خدا سے اس کا اختیار ہتھیانے والے کیسے عام آدمی ہو سکتے ہیں؟ خدا انھیں کیسے عام آدمیوں میں، انھی کی طرح کی شکلیں صورتیں دے کر، چلنے پھرنے کی اجازت دے سکتا ہے؟ ان دنوں وہ اسی شہر میں پڑھ رہا تھا، اور چھٹیوں پر آیا ہوا تھا، اور ہر بات سوچنے کی آزادی محسوس کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے کبھی نہ کبھی ایسے آدمی کا چہرہ ضرور بگڑتا ہوگا۔ اس نے جیسے اس الجھن سے نکلنے کی کوشش کی جو ایک قاتل کے ایک عام شخص لگنے سے اسے محسوس ہوئی تھی۔ پھر ایک عرصے بعد اس نے ایک اور قاتل کو دیکھا، جس کا چہرہ عام آدمی سے بھی زیادہ روشن تھا تو مزید الجھن میں مبتلا ہوا تھا۔ پھر اسے قتل سب سے زیادہ پریشان کن بات محسوس ہوئی تھی، اور اس نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا تھا یہ سب ایک عظیم بکواس ہے۔ اس کے باوجود وہ کئی دنوں تک مسجد کو آگ لگانے والے شخص کا چہرہ ذہن میں لانے کی کوشش کرتا رہا، کئی لوگوں سے پوچھا بھی کہ کسی نے اسے دیکھا تھا، مگر سب نے الگ الگ رائے دی تھی، کوئی کہتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی ڈاڑھی تھی، کوئی کہتا اس نے منھ پر کالے رنگ کا نقاب چڑھایا تھا جس میں صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، کوئی کہتا اس کی لمبی ڈاڑھی تھی، اور وہ ہنڈا سی ڈی سیونٹی پر ایک اور آدمی کے ساتھ بیٹھ کر آیا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ مسجد ہی میں جل مرا تھا۔ جیسے ہی اس نے آگ لگائی، بھاگنے لگا تو اندھا ہو گیا۔ اچانک وہ پیچھے مڑا اور مسجد کے لکڑی سے بنے مرکزی دروازے سے ٹکرایا اور گر پڑا، جسے آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ کہنے والے ایک انوکھی طمانیت محسوس کرتے تھے، لیکن وہ نئی نئی الجھنوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ جب وہ مسجد کو جلانے کی نیت سے وہاں پہنچا تب اندھا کیوں نہ ہوا؟ جس طاقت نے اسے بعد میں اندھا کیا، اسے ٹھیک وقت پر ٹھیک فیصلے کا خیال کیوں نہ آیا۔ یہی نہیں، ایک اور الجھن بھی اسے تھی۔ آدمی کو مارنے والا قاتل، قابل نفرت اور ہولناک جیسے لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے، مگر عمارتوں کو جلانے والے کے لیے کوئی لفظ اس کے ذہن میں نہ آ سکا۔ کیا اس لیے کہ یہ عمل ہی انسانی خیال کی دنیا سے باہر کا تھا، اس لیے لفظ نہیں گھڑا گیا، یا اس قدر ہولناک عمل ہے کہ وہ

Scanned with CamScanner

ایک لفظ میں نہیں سما سکتا؟ وہ اس مسجد کو دیکھنے کی ہمت جمع نہیں کر سکا تھا، مگر اس کے ذہن میں یہ سب چپک کر رہ گیا تھا۔ آج اس نے دوسری مرتبہ محسوس کیا کہ کسی مقدس عمارت کو جلانے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ شاید اسے بھی انھی دنوں جلایا گیا ہو، اس نے سوچا۔ اس شام، جب اس شہر کی مرکزی سڑک پر بلب اور ٹیوب لائٹیں جلنے لگی تھیں، اس کا دل بجھ چکا تھا، اور اس نے ایک بار پھر خود کو انھی دروازوں کے اندر پایا۔

جہاں سے بازار شروع ہوتا ہے، وہیں کتابوں کی بڑی دکان بھی اسی طرح ہے، اور آگے مین روڈ کے کنارے وہ ہوٹل جس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر ویک اینڈ پر کھانا کھانے آیا کرتا تھا، اسی طرح تھا۔ وہ ان عمارتوں کو دیکھتے ہوئے ایک طرف تشکر کے جذبات محسوس کر رہا تھا، اور ایک ایسی اپنائیت کا احساس بھی جسے محسوس کیے اسے زمانے ہو چکے تھے، اور دوسری طرف اپنے دل میں ایک ہولنا کی کو ساحل کی طرف سمندر کی لہروں کے بڑھنے کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح کے متضاد جذبات کا تجربہ کرنے کی اب اسے عادت ہو چلی تھی۔ اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ عمارتوں سے اپنائیت کا یہ احساس، اس احساس سے بالکل الگ ہے، جسے پرانے دوستوں سے ملنے پر آدمی محسوس کرتا ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر جس اپنائیت کا احساس ہوتا ہے، وہ بعض اوقات ایک پل میں، کسی ایک بات کے سبب، کسی ایک خیال کے سبب ختم ہو جاتا ہے، اور اپنے پیچھے موت جیسے زیاں کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔ وہ ایک عمارت کے سامنے رکا۔ سرمئی پتھروں سے بنی یہ عمارت، اردگرد کی نئی چمچماتی عمارتوں میں اجنبی، اداس اور قدرے شکست خوردہ لگ رہی تھی۔ اس نے اس کے لکڑی کے بنے بھاری دروازے کو دیکھا جو اس وقت بند تھا۔ اسے یاد آیا، یہی وہ پہلی عمارت تھی، جس نے اس کی توجہ کھینچی تھی، قدیمی بزرگانہ وقار کے سبب۔ وہ یہاں پینٹ کوٹ سلانے آیا تھا۔ اس کے مالک گزشتہ پچاس برسوں سے اس کام سے وابستہ تھے، اور بے حد وضع دار تھے۔ اسے لگا،، یہاں وقت ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر وہیں ٹھہرا رہا۔

دس بجنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ وہ واپس مڑا اور کتابوں کی دکان میں داخل ہوا۔ یہ دکان بھی کافی بدل گئی تھی۔ اسے یاد آیا اسی دکان میں جب وہ دس سال پہلے سرفرید کے ساتھ آیا تھا تو

Scanned with CamScanner

انھوں نے ایک دل چسپ بات اسے بتائی تھی۔ وہ کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک کتاب اٹھائی، شاید ایک ناول تھا۔ اسے رکھ دیا۔ پھر تاریخ کی ایک کتاب اٹھائی تھی۔ اسے بھی رکھ دیا۔ سر فرید نے کہا تھا، علی تم نے تین کتابیں اٹھائیں اور رکھ دیں۔ ذرا سوچو اگر تم ان کتابوں کے مصنف ہوتے، اور کوئی شخص ان کتابوں کو اٹھاتا، ایک نظر دیکھتا، درمیان میں کسی سطر کو پڑھتا، ناپسند کر کے رکھ دیتا تو تمھارا کیا ردِ عمل ہوتا؟ اس نے فوراً کہا کہ مجھے اس شخص کے ذوق اور اس کی کم علمی پر غصہ آتا۔ 'اس کا مطلب ہے کہ تم ٹھیک طرح سے یہ سوچنے سے بھی قاصر ہو کہ مصنف ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے'؟ سر فرید نے کہا تھا۔ علی کو خود اپنے ذوق اور کم علمی پر ہلکا سا خود غصہ اور شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ سر فرید نے بھانپ لیا اور اسے ایک مصنف کا قصہ سنایا۔ ایک مصنف کتابوں کی دکان پر گیا جہاں اس کی پانچ سات کتابیں رکھی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص ہماری طرح اس کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور رکھ دیتا ہے۔ وہ مصنف دیکھتا رہا۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کتابوں کی دکان کا مالک مصنف کے پاس ہی کھڑا تھا۔ پوچھا: تم افسوس کرنے کے بجائے مسکرا رہے ہو۔ مصنف نے کہا: جب کسی نئی بات کا انکشاف ہوتا ہے تو آدمی کو مسکراہٹ کی صورت میں انعام ملتا ہے۔ دکان کے مالک نے کہا کہ اس پر آپ کتاب لکھیں گے یا ابھی بتائیں گے؟ مصنف بولا: ابھی بتاتا ہوں، مجھے اس سوال کا جواب ملا ہے، جس کی تلاش میں ساری دنیا ماری ماری پھرتی ہے۔ دکان کا مالک مزید متجسس ہوا۔ بھائی قصہ یہ ہے کہ ہم سب مارے مارے پھرتے ہیں کہ خدا کو اس بات سے کتنی غرض ہے کہ لوگ اس کو مانتے ہیں کہ نہیں۔ دنیا کے بڑے جھگڑے، بڑے قتل اور بڑی جنگیں خدا کے نام پر ہی ہوئی ہیں۔ اپنے اپنے خدا کو منوانے کے لیے لوگوں نے دوسروں کے گھروں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، کھیتوں، یہاں تک کہ ان کے خداؤں کو آگ لگائی ہے۔ ابھی اس شخص نے میری کتابوں کو اٹھایا اور رکھ دیا، اور آگے بڑھ گیا تو مجھے ایک لمحے کے لیے برا نہیں لگا۔ یہ تو کتابوں کو دیکھنے اور پڑھنے والوں کی مرضی ہے کہ وہ کس کتاب کو پسند کریں اور کسے پھینک دیں۔ وہ گھر لے جا کر کتاب پر جو چاہے تبصرے کریں، سطروں کو کاٹ دیں، کسی سطر کو نان سینس کہیں، کسی پر ویل ڈن کہیں، یا سرے سے کتاب کو ردی میں پھینک

Scanned with CamScanner

دیں، پھاڑ دیں، یا اسے پکوڑے بیچنے والے کو دے دیں، مجھے ان سے باز پرس کا حق ہے کیا؟ میں نے کتابیں کچھ لوگوں کو ذہن میں رکھ کر ضرور لکھی ہیں، مگر میں یہ فرض کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا کہ سب لوگ میری کتابوں کو مانیں، اور ان کی تکریم کریں۔ بس مجھے خدا اور آدمی کے تعلق کی سمجھ آ گئی۔ وہ خدا جس کے تخلیق کی ہم خاصی بھونڈی نقل کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ اپنی تخلیق سے لاتعلقی نہیں ہے؟ دکان دار نے پوچھا۔ لاتعلقی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن وہ لاتعلقی جو ایک مصنف کو اپنی انا سے، اور انا سے نتھی ہو جانے والے غرور سے اختیار کرنی چاہیے۔ خدا نے کائنات بنادی، کسی سے پوچھے بغیر، لوگوں کو ان سے پوچھے بغیر پیدا کر دیا۔ اتنی سادہ سی بات ان بڑے دماغوں میں کیوں نہیں آتی؟ مصنف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے یہ واقعہ یاد آیا تو وہ مسکرا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ مدت بعد مسکرایا ہے۔ اس نے ایک ناول اور ایک اخبار خریدا اور دکان سے باہر آ گیا۔

وہ ٹھیک دس بجے سر افتخار کے گھر کے آگے کھڑا تھا، جو اس کے انگریزی کے استاد تھے۔ انھی سے ملنے کی خاطر وہ اس شہر میں آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گھر کا صرف گیٹ تبدیل ہوا ہے۔ پہلے شاید سیاہ رنگ کا چھوٹا دروازہ تھا، اب سفید رنگ کا لوہے کا خاصا بڑا گیٹ تھا۔ سر افتخار اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس نے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ وہ تپاک سے ملے۔ وہ گاؤں سے خاص طور پر چنے کی دال کا حلوہ بنوا کر لایا تھا۔ انھیں پیش کیا۔ سر افتخار نے اس کے والد کی خیریت پوچھی۔ معلوم ہونے پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ جب پیرنٹس ڈے کے موقع پر آیا کرتے تھے تو سر افتخار سے خاص طور پر ملتے تھے۔ دونوں کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

سر، میں بس ایک رات ہی کے لیے آیا ہوں، اور کچھ باتیں صرف تنہائی میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سر، تھینک یو سو مچ... فار..... الوئنگ می ٹو سی ایٹ دس آڈ ٹائم۔ اس نے تمہید باندھی۔ وہ ایک عرصے بعد انگریزی بول رہا تھا، اور لڑکھڑا رہا تھا۔

نو، اٹس او کے مائی ڈیئر، ٹیچر کے لیے کیا رات اور کیا دن۔ تم پریشان لگ رہے ہو۔ کیا والد کی ڈیتھ کے بعد زمینیں کسی نے چھین لیں؟ سر افتخار فکر مندی سے بولے۔

Scanned with CamScanner

نہیں سر، ابھی تو نہیں، لیکن اگر میری حالت یہی رہی تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ اس نے انگوٹھے سے قالین کو کھرچتے اور سر افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تمھاری حالت کو کیا ہوا؟ تمھاری شیو اتنی کیوں بڑھی ہوئی ہے؟

سر، میں بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ بھی مجھے ابنارمل نہ سمجھیں۔ ابا میرے لیے ایک صندوق چھوڑ گئے تھے۔ اس میں خالی کاغذ اور ایک آئینہ تھا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو اس میں..... سر میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی، بھول جاؤں۔ میں نے ہل چلائے، حساب کتاب میں دل چسپی لی، نیند کی گولیاں کھائیں، پر وہ عکس میرا پیچھا نہیں چھوڑتے جنھیں میں پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکا۔ اس نے جلدی جلدی سب کچھ اگل دیا جس طرح ڈاکٹر کے آگے کوئی مریض اپنی حالت عجلت میں بیان کرتا ہے۔

سر افتخار کچھ دیر خاموش رہے۔ علی گھبرا گیا۔ اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ تپائی پر کچھ تصویریں پڑی تھیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں ...ایک شاید ورڈزورتھ کی تھی۔ ایک کپلنگ کی، اور تیسری تصویر غالب کی تھی۔

تم چائے تو پیو، اور یہ ڈرائی فروٹ بھی کھاؤ، یہ میرے ایک عزیز شاگرد نے سوات سے بھجوائے ہیں۔

جی۔

اچھا تو تم نے آئینے میں اتنے عکس دیکھے۔ گڈ، ونڈرفل.... میجی کل ریلزم...

جی... اسے سمجھ نہیں آیا، سر کیا کہہ رہے ہیں۔

ایسا ہوتا ہے.... سب کے ساتھ نہیں..... سب کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، اگر سب کو.... ابا کا صندوق ملے.... (وہ ہنس دیے تھے)... آئی واز جسٹ کڈنگ مائی ڈیئر.... اینی ہاؤ.... آئی ٹرائی ٹو ایکسپلین اینڈ میک یو انڈرسٹینڈ.... تم ایک چیز دیکھتے ہو۔ تمھاری گواہی سے بڑی گواہی کس کی ہوسکتی ہے۔ اس دنیا کی اصل ٹریجڈی یہی ہے کہ آدمی کی اپنی گواہی کو ریجیکٹ کیا جاتا ہے، اور اس ٹریجڈی کا اگین ٹریجک اسپیکٹ یہ ہے کہ خود آدمی اپنی گواہی نہیں مانتا۔ لوگ آدمی کے تجربے کو سمجھنے کے بجائے

Scanned with CamScanner

ان پر ججمنٹ دیتے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں، پیپل آر ابسولیوٹلی ان جسٹ۔ کیلس...فولش...شٹ۔ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ دیکھنے کا آخر مطلب ہے کیا؟ دیکھنے کا مطلب ہے ایک آدمی کے پرسپشن میں، اس کے سینسز میں جو آیا، جو کچھ بھی آیا، وٹ ایور، جاگتے ہوئے آیا یا سوئے ہوئے آیا؛ اس کی عقل میں آیا ،یا ادر دین عقل کسی ذریعے سے آیا، جو بھی آیا، دیٹ از ریئل...وہ حقیقی ہے، اس شخص کے لیے حقیقی ہے۔ ہم ایک پل حقیقت کے بغیر بسر نہیں کرتے، نہ کر سکتے ہیں۔ جھگڑا اس بات کا ہے کہ ایک شخص اپنی حقیقت کو دوسروں کے لیے سٹینڈرڈ بنا لیتا ہے....دوسروں کو انڈرسٹینڈ کرنے کے بجائے ،انھیں انٹرپریٹ کرتا ہے، اور وہ بھی اپنی لمٹڈ عقل سے، اور معمولی تجربے سے، اور اس سب کو بھول جاتا ہے جہاں سے سب یہ آرہا ہے۔ حقیقی، غیر حقیقی کی بحث اتنی کمپلیکیٹڈ ہے....اتنی ہی کمپلیکیٹڈ جتنی.....ایک چیونٹی کا سوچنا....ایک مچھر کا سوچنا اور فیصلہ کرنا....جانتے ہو، چیونٹی کا سوچنا اس قدر کمپلیکیٹڈ نہیں ہے، جس قدر ہمارے لیے یہ سمجھنا کمپلیکیٹڈ ہے کہ ہمارے پاؤں تلے روندے جانے والی ننھی سی، حقیر مخلوق ہماری طرح کیسے سوچ سکتی ہے؟ چیزیں اپنے آپ میں اس قدر مسٹریس نہیں، جس قدر انھیں ہماری، ایگو، ہماری خود پرستی نے بنا دیا ہے... یاد رکھو فساد کی جڑ یہی ایگو ہے....لوگ کس آسانی سے دوسروں کو رد کر دیتے ہیں۔ ایڈیٹ...او، سوری....کسی کو ایڈیٹ کہنا بھی ایگو کی وجہ سے ہے۔

وہ ان سب باتوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے لگا ہے۔

تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ آر یو اٹینٹو؟

جی۔یس...یس سر۔

تم نے رئیلی آئینے میں کئی عکس دیکھے۔ تم ڈر گئے۔ اٹ ووڈ ہیو بین ہوریبل ایکسپیرنس...آئی کین انڈرسٹینڈ....یہ دونوں باتیں اتنی ہی سچی اور حقیقی ہیں، جتنی یہ بات کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور میری باتیں سن رہے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عکس کہاں سے آئے؟ بھائی آسان سا جواب ہے، عکس سامنے کی چیز کا ہوتا ہے۔ جن جن کے عکس تم نے دیکھے، وہ آئینے کے سامنے موجود تھے۔

مگر سر کیسے؟

جیسے تم میرے سامنے موجود ہو یا میں تمھارے سامنے موجود ہوں۔

میں سمجھا نہیں سر۔ سر، میں آپ کے سامنے ہوں، یہ ٹھیک ہے مگر بہت کچھ خود میرے اندر ہے جو میرے سامنے نہیں۔ میں پورا آپ کے سامنے کیسے موجود ہو سکتا ہوں؟

یہی کچھ میرے سلسلے میں، اور باقی سب کے سلسلے میں بھی ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہے، وہ سب سامنے آئے تو اس کا سامنا کرنے کی سٹر یجی ہمارے پاس نہیں۔ ابھی آدمی کے برین کو مزید ڈویلپ ہونا ہے۔ ابھی وہ یہاں اور وہاں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ اور سہار سکتا۔ تم اپنے مرحوم باپ، گھر میں موجود اپنی ماں، بیوی بچے کو بھی دیکھ رہے ہو، اور یہاں مجھے اس کمرے میں موجود سب اشیا کو بھی، لیکن ان سب کو ایک ساتھ، ایک ہی طرح کی کوگنیٹو کلیریٹی کے ساتھ ادراک میں نہیں لا سکتے۔ اس سے ایک عظیم گڑ بڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ تمھاری دنیا حقیقی اور غیر حقیقی دنیاؤں میں بٹ جاتی ہے۔ تم کبھی ادھر ہوتے ہو، کبھی ادھر۔ تم بٹے رہتے ہو۔ تم دو کشتیوں میں سفر کرتے رہتے ہو، اس لیے ہر وقت خطرے میں گھرے رہتے ہو۔ خطرے میں گھرے رہنے میں بھی حرج نہیں کہ اس سے ہماری سینسز پوری طرح بیدار ہو جاتی ہیں۔ خطرے کی حالت میں بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا پاؤں ایک کشتی میں ہو اور فکر دوسری کشتی کی ہو۔ کوئی پاؤں اور فکر کو یکجا کر لے تو...... بڑی بات ہے!

علی کو کچھ کچھ یہ باتیں سمجھ آ رہی تھیں، مگر اس کا ذہن کوگنیٹو کلیریٹی میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس نے گزشتہ کئی سالوں میں کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، حالاں کہ ان کے والد اسے اکثر کوئی کتاب پڑھنے کے لیے دیا کرتے تھے۔ اس نے کچھ کتابیں پڑھنے کی کوشش کی تھی، مگر اسے جلد ہی الجھن محسوس ہونے لگتی۔ اس نے بہ مشکل بی اے کیا تھا۔ ایف ایس سی اگرچہ اسی شہر سے اچھے نمبروں سے کی تھی، مگر آگے پڑھنے سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ بی اے بھی جیسے تیسے اپنے آبائی گاؤں کے ضلعی کالج سے کیا تھا۔ جب وہ اسی شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو سرفرید کے کہنے پر کچھ کتابیں آدھی پونی پڑھی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک غور کرنے سے دماغ کو پریشان ہوتا محسوس کرتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اخبار پڑھ لیا کرتا تھا۔ لیکن جب اس نے غور کیا کہ وہ سر افتخار کی باتیں سنتے ہوئے، کچھ دوسری باتیں سوچنے لگتا تھا، تو ایک لہر کی طرح سر افتخار کی ایک بات گزر جاتی تھی، اور اگلی

Scanned with CamScanner

بات کو سمجھنے میں اسے مشکل ہوتی تھی۔اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سر اسی کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ پاؤں ایک کشتی میں اور فکر دوسری کشتی کی۔

دیکھو علی بیٹے۔وہ سب عکس تمھارے تھے۔تم خوش نصیب ہو کہ تم نے وہ دیکھ لیے۔کروڑوں لوگ ساری عمر نہیں دیکھ پاتے۔میں نے تمھیں اس سے زیادہ بتایا تو تم پر ظلم ہوگا۔

علی کو یہ بات پوری طرح سمجھ نہیں آئی تھی ،مگر اسے لگا کہ ایک نیا دروازہ کھلا ہے،جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ ڈرے گا نہیں۔

رات کے ایک بجے وہ ہوٹل پہنچا۔مدت بعد وہ گہری نیند سویا۔

اس نے اپنے باپ کی کتابوں میں سے کچھ کو پڑھنے کا فیصلہ کیا۔پہلی کتاب اٹھائی۔یہ کتاب شکار کی کہانیوں پر مشتمل تھی۔پہلی کہانی پڑھنا شروع کی۔جب وہ کہانی میں اس مقام پر پہنچا جہاں شکاری ایک جنگل میں راستہ بھٹک گیا،اور اس کا سامنا ایک گینڈے سے ہوا تو اس نے کتاب رکھ دی۔اسے یہ کچھ کچھ جانی پہچانی سی کہانی محسوس ہوئی۔تھوڑی دیر اسے یہ سمجھنے میں دقت ہوئی کہ اس کہانی میں کیا چیز جانی پہچانی تھی ،پھر ایک دم اس کے ذہن میں ایک پرانی یاد ظاہر ہوئی؛وہ کالج کے دنوں میں مرزا کو گینڈا کہا کرتا تھا۔وہ گینڈے کی طرح ہی موٹا،سست اور منتقم مزاج تھا۔دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت تو نہیں آئی تھی ،مگر اس نے کئی بار علی کو ہاسٹل کے سامنے کے پلے گراؤنڈ میں خوں خوار آنکھوں سے دیکھا تھا۔باتیں بھول جاتی ہیں،مگر یہ ظالم نگاہیں جیسے ہمیشہ کے لیے یادداشت میں نقش ہو جاتی ہیں۔علی نے سوچا۔رات کو سونے سے پہلے ،وہ اکثر سوچتا کہ وہ مرزا کی آنکھیں نکال ڈالے گا۔اس وقت یہ سب سوچتے ہوئے ،اس نے ایک بار پھر غصہ محسوس کیا،مگر اس بار خود پر۔وہ حقیقت میں بزدل تھا ،مگر خیال ہی خیال میں بہادر بننے کی کوشش کرتا رہتا تھا،اور اپنے اندر وہ ساری نفرت بھر لیتا تھا جسے وہ مرزا کی خوں خوار آنکھوں کو سامنے محسوس کرتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔اس نے سخت بے چینی محسوس کی۔تھوڑی دیر اٹھ کر کمرے میں چلا۔اگر میں اس شکاری کی جگہ ہوتا.....چلتے چلتے اس

نے سوچا۔اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے ابا کا پسٹل جیب میں رکھنا چاہیے۔کسی وقت ضرورت پڑسکتی ہے۔لیکن پسٹل سے گینڈے کو نہیں مارا جاسکتا،کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔ہر وقت گن بھی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ مجھے بخشو کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اسے گن چلانا آتی بھی ہے کہ نہیں۔ میں نے خود بھی کبھی گن نہیں چلائی۔وہ اب بیزاری محسوس کرر ہا تھا۔اس نے ایک بار پھر کتاب اٹھائی،اوراسے پڑھنا شروع کیا۔گینڈے نے شکاری کو دیکھا۔اگر میں نے اپنے حواس کو قابو میں نہ رکھا تو سمجھو میں جان سے گیا،شکاری نے خود سے کہا،اوراپنی بندوق کا رخ گینڈے کی طرف کیا۔گینڈے نے اچانک اس کی طرف بھاگنا شروع کیا۔یہاں پہنچ کراس نے ایک بار پھر کتاب رکھ دی۔کوئی گینڈا تمھاری طرف بھاگنا شروع کرتا ہے،تمھارے ہاتھ میں بندوق ہے۔تم نے ایک فیصلہ کرنا ہے۔اپنی جان بچانی ہے،یااس کی جان لینی ہے۔تم ایک فیصلے پرفوراً پہنچ جاتے ہو،خودکو بچاتے ہو،مگرایک گینڈے کا مرنا کچھ معنی نہیں رکھتا؟ایک جنگل میں اتنا بڑاوجود موت کے منہ میں اس لیے چلا جائے کہ اس سے تمھیں خطرہ تھا؟ خطرے میں گھرے ایک انسان کوایک جیتے جاگتے،لحیم شحیم وجودکواس طرح کاٹ ڈالنے کا حق ہے جسے فطرت نے اتنی محنت سے بنایا ہے؟ یہ میں کس قسم کی باتیں سوچ رہا ہوں؟ اس نے خود سے کہا۔یہ میں کس دنیا میں پہنچ گیا ہوں؟ خیال،سوال،عکس،ہندسے،تصویریں ،یادیں؟؟؟؟اس نے جیسے اپنی صورت حال کو پہچانا۔سرافتخار نے کہا تھا کہ وہ سب میرے عکس تھے۔ میرے عکس،مجھ میں کہاں کہاں چھپے ہیں؟ میں کہاں ہوں؟ میں اور میرے عکسوں میں کیا تعلق ہے؟ میں اپنے ہی عکس کو نہ پہچان سکوں،یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اس نے آنکھیں بند کیں،اورایک ایک عکس کوغور سے دیکھنے کی کوشش کی۔اس نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن میں اس وقت تو صرف عکسوں کے زیادہ ہونے کی ایک چبھتی ہوئی یاد ہے۔اس نے کوشش جاری رکھی۔کچھ دیر بعد کچھ عکس ابھرنے لگے،مگر مدھم،ادھورے،کٹے پھٹے۔اسے پہلی مرتبہ عکسوں کے رنگ کے بارے میں خیال آیا۔سب بلیک اینڈ وائٹ فوٹو کی مانند تھے،یا شاید سائے کی طرح تھے۔حالاں کہ آئنے میں اس نے جیتے جاگتے چہرے دیکھے تھے۔اس نے ایک عکس پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔اسی کوشش کے دوران میں اس نے دیکھا کہ وہ جنگل میں ہے،اور سامنے گینڈا

Scanned with CamScanner

ہے۔ یہ کیا؟ وہ سوچتا کچھ چاہتا ہے، اور سوچتا کچھ ہے؟ یہ کون ہے جو میرے ارادے کے برعکس چلتا ہے، جو میرے ارادوں کو شکست دینے پر تل جاتا ہے؟ اس نے اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے خود کو ایک بند گلی میں پایا۔ وہ مڑا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ماموں زاد کے ساتھ ہے۔ وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک سولنگ پر سائیکل پر سوار باتیں کرتے آرہے ہیں۔ سائیکل اس کا ہم سن ماموں زاد چلا رہا ہے۔ وہ اچانک سائیکل روکتا ہے۔ نیچے اترتا ہے۔ سڑک کے کنارے پر ایک اخبار کا ٹکڑا پڑا ہے۔ اسے اٹھالیتا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ اسے جہاں کہیں اخبار ملتا تھا، اسے پڑھنے لگ جاتا تھا۔ لہٰذا اسے حیرت نہیں ہوئی۔ ابھی اس نے غور کیا کہ اس اخبار کے ٹکڑے پر ایک تصویر تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر۔ اس کے ساتھ ایک موٹی سرخی تھی۔ سیاہ۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اتنی مدت بعد اسے وہ تصویر صاف، کوگنیٹو کلیریٹی کے ساتھ دکھائی دی۔ حالاں کہ اس وقت اس نے اسے بالکل سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ وہ کہاں چپک کر رہ گئی تھی!

اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی، اور گزرے دنوں کو یاد کرنے لگا۔ وہ گرمیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ سکول سے چھٹیاں تھیں۔ دونوں نے نئی نئی سائیکل چلانی سیکھی تھی۔ دونوں نے ایک بالکل نئی دنیا دریافت کی تھی، جس کی حیرت تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ صبح، دوپہر، شام، رات ہر وقت سائیکل پر گھوما کرتے، والد صاحب کی ڈانٹ کی پروا کیے بغیر، اور والدہ کی منت سماجت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ دو مرتبہ چوٹ بھی لگی۔ پہلی بار دائیں ٹخنے کے نیچے خاصا زخم لگا تھا، جب ماموں زاد سائیکل چلا رہا تھا اور وہ کیریئر پر بیٹھا تھا اور پچھلے پہیے میں پاؤں آگیا تھا، پر اس نے سی تک نہ کی تھی، اور کئی دن گھر والوں کو خبر بھی نہ ہونے دی تھی۔ گرمیوں کی اس سہ پہر سے ایک دن پہلے اس نے والد صاحب کو غیر معمولی جوش میں دیکھا تھا۔ 'اس ظالم کے ساتھ یہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا'۔ اسے والد صاحب کا جوش تو محسوس ہوا تھا، مگر ان کے اس جملے سے کوئی دل چسپی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسے اب صاف محسوس ہوا کہ اخبار میں موٹی سیاہ سرخی اور کسی ملبے کی تصویر کا اس کے والد صاحب کی بات سے کوئی لازمی تعلق تھا۔ اسے کچھ اور باتیں بھی یاد آئیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے والد اگلے کئی دن گھر سے باہر رہے تھے۔ والدہ نے بتایا کہ وہ کسی کام سے شہر گئے تھے، لیکن اس سے پہلے کچھ لوگ والد صاحب سے

ملنے بھی آئے تھے۔ سب خوش تھے، پر کسی کسی وقت افسوس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس نے باقی باتوں کو چھوڑ کر تصویر پر توجہ مرکوز کی۔ وہ ایک تباہ شدہ منظر کی تصویر تھی، جس کے ایک کونے میں وردی میں ملبوس شخص کی چھوٹی سی تصویر اسے نظر آئی۔ اسے یاد نہیں آیا کہ اس وقت اخبار میں بھی اس شخص کی تصویر تھی یا نہیں، مگر اس وقت اسے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نے آئنے میں وردی میں ملبوس اس شخص کو دیکھا تھا۔ ایک سنگین قسم کی سنجیدگی اس کے چہرے پر تھی، اور ایک آنکھ جیسے پتھرائی ہوئی تھی!

یہ دیکھ کر اس کی حیرت مزید بڑھ گئی کہ اس تصویر کے ساتھ ہی اسے کچھ جانے پہچانے چہرے یاد آنے لگے۔ اس نے ذہن پر زور دیا تو ان میں ایک چہرہ اس کے دادا جان کا تھا۔ دادا جان نے بچپن میں ایک مرتبہ اسے تھپڑ رسید کیا تھا۔ اس لمحے اس نے دیکھا کہ دادا کا چہرہ اسی طرح کی سنگین قسم کی سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر دادا جان کی مانند بنے گا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ چہرے وہ تھے جو ابا جان کے پاس اس دن آئے تھے، جب ابا جان نے کہا تھا کہ اس ظالم کے ساتھ یہ بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ اب اسے کچھ دوسری تصویریں بھی صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ ایک تصویر میاں حیات کی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان سے مشورہ کرنے کا غیر ارادی خیال انھیں کیوں آیا تھا۔ لیکن میاں حیات کی جس تصویر کو اس نے آئنے میں دیکھا تھا وہ کافی پرانی تھی۔ یہ بات اسے اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا جب اس کے چھوٹے چچا کی شادی ہوئی تھی، تب وہ میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تھا۔ ان کی حویلی سے ذرا فاصلے پر بڑے بڑے سرخ پھولوں والے ٹینٹ لگے ہوئے تھے۔ شاید اپریل کا مہینہ تھا۔ دھوپ میں بیٹھنے سے گرمی محسوس ہوتی تھی اور ٹینٹ کے نیچے بیٹھنے سے ٹھنڈ محسوس ہوتی تھی۔ ٹینٹ کے نیچے دریاں تھیں اور ان پر چار پائیاں کچھ اس ترتیب سے لگائی گئی تھیں کہ مستطیل کی شکل بن گئی تھی۔ سامنے تین چار پائیوں پر اس کے والد، چچا، ماموں، کچھ دوسرے بزرگ بیٹھے تھے، اور بائیں جانب چار پائیوں کی قطار میں پہلی چار پائی پر وہ اپنے ماموں زاد اور کچھ اور رشتہ دار لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سب کی نظریں چار پائیوں کے درمیان کی خالی جگہ پر ڈھلتی عمر کے دو آدمیوں پر مرکوز تھیں جن میں سے ایک کے ہاتھ میں چھوٹا تھا۔ دونوں نے سفید کرتوں پر سرخ رنگ

کی جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں، اور سفید لٹھے کی چادریں باندھ رکھی تھیں۔ دونوں جگت کر رہے تھے۔ جگتیں نیم فحش تھیں، پر کسی کو ان کے فحش ہونے کا خیال نہیں تھا۔ سب ہنس رہے تھے، کچھ اونچے اونچے قہقہے لگاتے تھے۔ وہ کچھ سفید پگڑی والوں کو مخاطب کرتے تھے، اور انھیں جگت لگا کر ان سے پیسے وصول کرتے تھے۔ اچانک سب کی ہنسی رک گئی، اور ایک بھگدڑ سی مچ گئی، جس کا آغاز خود اس کی چیخ سے ہوا تھا کہ ٹینٹ کو سہارا دینے والے بانسوں میں سے ایک بانس گرا اور سیدھا اس کے سر پہ آ لگا تھا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کی کھوپڑی کے بایاں حصے سے، شروع ہو کر اس کے دایاں حصے میں پھیل گئی تھی، اور اس نے زور کی چیخ ماری تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ اس نے خود کو ایک چارپائی پر لیٹا ہوا محسوس کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک گومڑ سا محسوس ہوا، جس سے درد کی وہی لہر دوبارہ اٹھی۔ وہ کراہا، تبھی سامنے میاں حیات تھے جنھوں نے کہا: ہر پیڑ بندے کو بہادر بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی لمحے اسے دادا جان کا تھپڑ یاد آیا، اور اس نے سوچا میں میاں حیات کی مانند بنوں گا۔

اس نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے وہ چہروں کو پہچانتا جا رہا تھا، ان میں سے کچھ کے عکس غائب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ انھیں دوبارہ ذہن میں لانے کی کوشش کرتا تو اسے لگتا جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ جیسے کچی پنسل کے بنے کسی خاکے کو اریز کر دیا گیا ہو۔ مگر کچھ عکس زیادہ روشن ہو گئے تھے، ان میں سب سے روشن عکس خود اسی کا تھا، جو اس تصویر میں قید تھا جسے اس نے سکول کے دنوں میں بنوایا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ان دیواروں سے باہر نکل آیا ہے، جہاں ایک دروازہ، کسی اور دروازے کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی اس کے ذہن میں ایک بچے کا تصور، ایک جھماکے سے پیدا ہوا، جس کا چہرہ کھکھلا رہا تھا۔ اسے لگا اس بچے کو خود اس کے ذہن کی کوکھ نے جنم دیا ہے۔ اس کے خدوخال کسی سے ملتے نہیں تھے۔ اسی کھلکھلاہٹ کے ساتھ ہی اس نے زندگی میں پہلی بار دیوار پر بیٹھی چڑیا کی چوں چوں اس طور سنی جیسے وہ دنیا کی سب سے عظیم سچائی کی علمبردار ہو، اور خاص اس کے لیے کسی دور دراز کے جزیرے سے لمبا سفر کر کے یہاں آئی ہو۔

ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر وہ اٹھا۔ تیز قدموں سے کمرے میں گیا، ایک جھٹکے سے ابا کا صندوق کھولا۔ آئینہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا۔ آئینہ اٹھایا ہی تھا کہ صندوق کا ڈھکنا گرا، اور اس کا سامنے کا

Scanned with CamScanner

سر آ آئنے سے ٹکرایا۔ کچھ نوکیلے ٹکڑے اس کے ہاتھ میں چبھے۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر خون کی لکیر نمودار ہوگئی۔

تھوڑی دیر تک اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے معطل رہی۔ دو ایک لمحوں بعد یہ صلاحیت بحال ہوئی۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا!

ایک صندوق اب مجھے تیار کرنا ہے، شیو بناتے ہوئے، اس نے مدت بعد اپنے بیٹے کے بارے میں سوچا۔

■•◆•◆•◆•■

Scanned with CamScanner

ہوسکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو

میں جس کتاب کا مطالعہ کررہا تھا، وہ دو ہفتے پہلے ختم ہوئی تھی۔ یہ دو ہفتے میں نے بغیر پڑھے گزارے، اور خاصے پرلطف گزارے۔ ایک ہلکے سے خمار کی کیفیت رہی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں دل کو لبھاتی رہیں۔ دل اس یقین سے خوش رہا کہ جس چیز کا جو مقام ہے، وہ اسی پر ہے۔ مگر دو دن سے ذہن کسی بات پر ٹھیک طرح ٹک نہیں پا رہا تھا۔ جیسے لٹو کی رفتار سست ہوجائے تو پہلے اس کا توازن بگڑتا ہے، پھر وہ اِدھر یا اُدھر ڈھہنے لگتا ہے۔ مجھے دھوپ چبھنے لگی تھی، آنکھوں میں تنکے اٹکنے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی بات بری لگنے لگی تھی اور معمولی سے شور پر کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہونے لگے۔ وجہ بے وجہ الجھن اور بدمزگی کا احساس ہونے لگا۔ ایک شام گھر میں داخل ہوتے ہی چوکھٹ سے پاؤں رپٹ گیا تو میں بیگم پر برس پڑا کہ اسے صفائی کروانے کا سلیقہ نہیں۔ وہ حیرت اور کچھ کچھ غصے سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں سمجھ گیا۔

اتوار کی صبح ہی میں گھر سے نکلا، اور پرانی کتابوں کے بازار میں پہنچ گیا۔ میں نے کتاب خریدنے کا ایک اپنا اصول بنا رکھا ہے۔ اپنا اصول بنانے میں مجھے ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں، پیسے اور وقت کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا ہے، ایک آدھ بار تو خفت بھی اٹھانی پڑی ہے، مگر شکر ہے کہ میں کتاب خریدنے کا اپنا اصول بنا چکا ہوں۔ جو اعتماد اور لطف اپنے اصولوں پر چلنے میں ہے، وہ مانگے تانگے کے اصولوں میں بالکل نہیں۔ خیر میرا اصول یہ ہے کہ کتاب خریدنے میں جلدی نہیں مچانی، جس کا مظاہرہ میں جوتوں، شرٹوں اور ٹائیوں کے ضمن میں کرنے کا عادی ہوں۔ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے،

درجنوں کتابیں دیکھتا ہوں۔ پہلے ایک سرسری مگر احاطہ گیر نظر سامنے پڑی کتابوں پر ڈالتا ہوں۔ یہ ایک زبردست لمحہ ہوتا ہے۔ آنکھوں کی آوارگی کے لیے اس سے بہتر کوئی منظر نہیں۔ اتنے رنگ، اتنی تصویریں، اتنے مختلف طریقوں سے لکھے گئے طرح طرح کے الفاظ۔ آنکھوں کی تو عید ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ کتابیں باری باری اٹھاتا ہوں۔ کچھ کا سرورق اور فہرست ہی دیکھ کر واپس رکھ دیتا ہوں۔ کچھ کے ابتدائی صفحات پر نظر ڈالتا ہوں۔ کسی کا ایک آدھ پیراگراف بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ایک لمحہ آتا ہے ، جب درجنوں کتابوں میں سے ایک کتاب باقاعدہ مجھ سے کلام کرتی ہے۔ یہ لمحہ بھر کا کلام ہوتا ہے۔ ایک الگ طرح کی سرگوشی ہوتی ہے۔ رازدارانہ قسم کی۔ صرف میں ہی سن سکتا اور سمجھ سکتا ہوں، حالاں کہ یہ ایک ایسا کلام ہے، جس میں آواز نہیں ہوتی۔ یہ بے آواز لفظ ہوتے ہیں۔ یہ کلام اس قدر توجہ انگیز، اس درجہ غلبہ آفریں ہوتا ہے کہ میں خود کو اس کے آگے بے بس محسوس کرتا ہوں۔ خود میری حالت عجیب ہوتی ہے، کسی ایسی گہرائی میں ایک زخم سا نمودار ہوتا ہے، جس سے میں پہلے واقف ہی نہیں ہوتا۔ مجھے سرگوشی بتاتی ہے کہ اس کا اندمال اس کتاب میں ہے۔ اس روز بھی ایک پرانی کتاب نے مجھ سے سرگوشی کی۔ میں نے اسے لے لیا۔ میں ایک وقت میں عام طور پر دو کتابیں خریدتا ہوں، مگر اس روز ایک ہی پر اکتفا کیا۔ میں یہاں اعتراف کرتا چلوں کہ میں نے اسی طرح اپنی ہستی کو لگنے والے وہ سب زخم سیئے ہیں جو مجھے دوسروں کے ہاتھوں، اپنے ہاتھوں، اور نادیدہ ہاتھوں سے لگے ہیں۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس کی ورق گردانی کی تو اس میں مجھے یہ خط ملا جس کی وجہ سے مجھے یہ سب لکھنا پڑ رہا ہے۔ اسے کھول کر دیکھا تو پھٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے تہ کیا اور کتاب میں رکھ دیا۔ یہ ایک معمولی سی بات تھی، ایک کتاب میں ایک خط کا ملنا بڑی بات تھی، نہ خلاف واقعہ، مگر اسی بات نے ایک لمحے کی اس سچائی میں بری طرح مداخلت کرنے کی طاقت حاصل کرلی تھی، جسے کتاب ، اس کی سرگوشی، اس کے انتخاب نے مل جل کر جنم دیا تھا، اور جسے میں اپنی، خالص ذاتی قسم کی سچائی سمجھ کر کچھ کچھ خودغرض ہو گیا تھا۔ ہم جیسے معمولی لوگ، جنھیں بڑا دماغ ملا ہے، نہ بڑے لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہے، مگر جو اپنے زمانے کے بڑے بڑے دعووں پر ایمان لانے کے سلسلے میں کاہل واقع ہوئے ہیں، انھیں یہی چھوٹی، ایک پل کی خودغرضانہ سچائیاں اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

میری حالت کچھ کچھ اس بچے کی سی ہوگئی جو شوق سے آئس کریم کھا رہا ہو، اور اچانک اس میں ایک پتھر کا ریزہ نکل آئے، اور اس کا مسوڑا زخمی ہو جائے۔

میں زخمی مسوڑے کے ساتھ گھر پہنچا۔ میرے لیے کتاب سے زیادہ وہ خط اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ یہ میرے ساتھ زبردستی اور ناانصافی تھی۔ جب کوئی چیز اچانک آپ کی زندگی میں، آپ کی مرضی کے بغیر اہمیت اختیار کر جائے، اور آپ کی بنائی ہوئی ترتیب کو برہم کر ڈالے تو یہ زبردستی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس زبردستی کے خلاف احتجاج کیا۔ پہلے سوچا خط پھینک دوں، اور اطمینان سے کتاب پڑھوں، مگر ایک خیال نے مجھے روک لیا۔ خیال یہ تھا کہ خط تو ایک ذاتی چیز ہے، خواہ وہ راہ چلتے کھلا ملا ہو، یا کسی پرانی کتاب میں۔ کسی کی ذاتی شے کو نہ تو پڑھنے کا مجھے حق ہے، نہ اس طرح پھینکنے کا۔ میری مشکل کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جن کا واسطہ دوسروں کی ذاتی چیزوں سے پڑ چکا ہے، یا جن کی ذاتی چیزیں دوسروں کے پاس، غلطی سے پہنچی ہیں۔ دوسروں کی ذاتی چیز، آپ پر دہری ذمہ داری عائد کرتی ہے۔ اس کی حفاظت اور متعلقہ شخص تک اسے پہنچانے کی ذمہ داری۔ یہ تو واقعی میرے ساتھ ناانصافی تھی۔ میری بنائی ہوئی ترتیب ہی برہم نہیں ہوئی تھی، ایک کہیں دوسری جگہ پر قائم ہونے والی ترتیب مجھ پر مسلط ہوگئی تھی۔ خیر میں نے سوچا، اس کے لکھنے والے کا نام دیکھوں اور اس تک یا اس کے لواحقین تک پہنچانے کی کوشش کروں۔ یہاں مجھے رکنا پڑا۔ کیا میں کسی اور کی ذاتی شے میں اتنا دخل دے سکتا ہوں؟ میں نے اس نادیدہ ہستی سے پوچھنے کی جسارت کی جس نے میرے لیے یہ نئی ترتیب قائم کی تھی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے سوچا وہ کسی اور کے لیے کوئی اور طرح کی ترتیب مقرر کرنے میں مصروف ہوگی۔

مجبوراً میں نے خط کے آخر میں نظر ڈالی۔ مکتوب نگار کا نام نہیں تھا۔ میں نے کتاب کو پھرولا۔ خیال تھا کہ خط کا باقی حصہ کسی اور جگہ موجود ہو، مگر کتاب میں سے خالی کاغذ کا ایک تکونا کٹا ہوا ٹکڑا ملا۔ کتاب کا پہلا صفحہ دیکھا۔ شاید وہاں کتاب کے مالک نے اپنا نام لکھا ہو۔ مایوسی ہوئی۔ اب میں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ کتاب کے سرورق پر نظر ڈالی۔ دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی عورتیں۔ یہ تھا کتاب کا نام۔ (یہاں مجھے بتا دینا چاہیے کہ مجھے عورتوں، بچوں، پودوں، جانوروں پر لکھی

گئی کتابوں سے حد سے بڑھی ہوئی دل چسپی ہے)۔ نامعلوم مصنف کی کتاب کا اردو ترجمہ تھا، سنہ اشاعت بھی ندارد تھا۔ مترجم کا نام کتاب کی پرنٹ لائن میں مدھم سا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایک بات سمجھ آگئی۔ مکتوب نگار کو عورتوں کی تاریخ سے دل چسپی تھی۔ بعد میں مجھے خود پر ہنسی بھی آئی کہ میں نے کتنی عجلت سے یہ طے کرلیا تھا کہ مکتوب نگار ہی اس کتاب کا مالک بھی تھا اور اس نے اپنی دل چسپی کے مطابق ہی کتاب خریدی تھی۔ ہوسکتا ہے، مصنف نے کسی اور کی کتاب میں اپنا خط رکھا ہو۔ ہوسکتا ہے، مکتوب الیہ نے یہ خط اس کتاب میں رکھا ہو۔ مکتوب الیہ کون ہوسکتا ہے؟ خط 'بھائی صاحب' سے شروع ہوتا تھا، اس لیے اس کا اتا پتا بھی کتاب میں کہیں نہیں تھا۔

میں ایک اندھیری گلی میں تھا، اور راستہ ٹٹول رہا تھا۔

میں اگلے اتوار اس شخص کے پاس پہنچ گیا، جس سے کتاب خریدی تھی۔ پوچھا، یہ کتاب اسے کہاں سے ملی؟ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔ الٹی پلٹی۔ 'یہ مجھے ایک مرحوم وکیل کے بیٹے نے بیچی۔ مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں ہزاروں کتابیں تھیں'۔ اس نے مجھے بتایا۔ 'کیا آپ مجھے اس کا نام پتا بتا سکتے ہیں؟' میرے اس سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ اس نے مجھے منع کر دیا ہے۔ آپ سے پہلے بھی کچھ لوگ اس سے ملنے جا چکے ہیں۔ اس کی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہوتی ہے کہ اسے پڑھنے والے، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس کا بیٹا، جو خود ایک معروف بیرسٹر ہے، عاجز آگیا ہے۔ میں نے کافی اصرار کیا، مگر کتب فروش نہیں مانا۔ اسے شاید بیرسٹر سے مزید کتابیں خریدنی تھیں۔

جب میں نے مرحوم وکیل کے بیٹے سے ملنے کی وجہ بتائی تو اس نے مجھے کئی مزید دل چسپ باتیں بتائیں۔ مرحوم وکیل کی ہر کتاب میں کوئی تحریر یا تصویر ملی ہے۔ لوگ وہ تصویریں لے کر آتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ وہ کس زمانے کی عورتوں اور بچوں کی تصویریں ہیں۔ کچھ کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید مرحوم وکیل کے خاندان کی عورتوں کی تصویریں ہوں، مگر اس کے بیٹے نے بتایا کہ وہ سب تصویریں مختلف زمانوں کی عورتوں اور ان کے بچوں کی ہیں، ان کے خاندان کی کسی عورت نے بیس سال پہلے کبھی

Scanned with CamScanner

تصویر نہیں بنوائی تھی۔ ہوسکتا ہے، کچھ تصویریں اس کے کلائنٹس کی ہوں، مگر یہ گمان ہی ہے۔ بیرسٹر اپنے والد کی کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ بری طرح خوفزدہ ہے۔ مجھے کتب فروش نے بتایا ہے کہ بیرسٹر کہتا ہے کہ ایک بیماری ہوتی ہے، جسے وہ کوئی الٹا سا نام دیتا ہے، پرانی چیزوں کا ڈر۔ کوئی فوبیا وو بیا کہتا ہے۔ ہاں، یاد آیا پے...لیو... ہاں پیلیوفوبیا شاید۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح الرجی کسی بھی شے سے ہوسکتی ہے، مٹی و کاغذ سے لے کر روٹی و درختوں اور خوشبوؤں تک سے، اسی طرح ڈر کسی چیز کا بھی ہوسکتا ہے۔ چناں چہ اس نے کتابیں ہی نہیں، پرانے زیور، پرانے برتن، پرانی الماریاں، پرانی تصویریں، پرانے کپڑے، پرانے جوتے سب بیچ باچ دیا ہے۔

یہ تو بہت ہی دل چسپ ہے، اس خط سے بھی زیادہ۔ میں نے خود سے کہا۔ میں نے سامنے پڑی پرانی کتابوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے تو ان میں کافی کشش محسوس ہوئی۔ میرے بس میں ہو تو گھر سے سب نئی کتابیں نکال دوں اور صرف پرانی کتابیں رکھوں، حالاں کہ مجھے کتابیں زیادہ پڑھنے کا شوق نہیں۔ سال میں چھ سات سے زیادہ کتابیں پڑھنا میں اپنے اوپر ظلم کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اب تو میں نے طے کیا ہے کہ صرف پرانی کتابیں ہی پڑھوں گا۔ کیوں کہ ان میں کچھ ایسا بھی ہوتا ہے، جو کتاب سے ہٹ کر ہوتا ہے، جیسے اس کتاب کا خط۔ اس نے میرے اندر مہم جوئی اور ایک نئی قسم کی اخلاقی ذمہ داری کا ایک ایسا احساس پیدا کر دیا ہے، جو نئی کتاب سے ممکن ہی نہیں۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے جو صرف پرانی کتابوں سے مخصوص ہے۔ پرانی کتابیں ہمیں وقت سے متعلق ایک نئی بات بتاتی ہیں۔ یہ کہ وقت ہمیشہ سے ایسا نہیں، جیسا ان دنوں ہے۔ ہم سے مختلف اور ہم سے زیادہ دل چسپ زمانے اور لوگ اور واقعات، سوچنے کے طریقے، رہنے بسنے کے طریقے ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی آج کل جس طرح کی خوف بھری زندگی گزارنے پر میں کیا ہم سب مجبور ہیں، اور اسی کو کل زندگی سمجھتے ہیں، اس سے نکلنے کا ایک راستہ، وقت کے بارے میں نئی طرح سے سوچنے سے مل سکتا ہے۔ پھر ان کتابوں سے کچھ نئے قسم کے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں، جو اس خط کے سبب پیدا ہوئے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں یہ مجھے مداخلت محسوس ہوئی تھی، مگر اب دل چسپ اور مہم جویانہ لگا ہے۔ آدمی اور اس کے احساس کے بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے! بھئی اگر الرجی کسی شے سے ہوسکتی ہے، خوف کا سبب کچھ بھی ہوسکتا

Scanned with CamScanner

ہے تو کچھ دل چسپ، مہم جویانہ، جینے کے قابل بنانے والے احساسات کا باعث بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کم از کم میں تو اس دنیا کو نہ فتح کرنے آیا ہوں، نہ صبح سے شام تک کی بے معنی ٹرٹر میں اپنی حیاتی ضائع کرنے۔ ایک معمولی سا نیا احساس مجھے اس دنیا کے جنت ہونے کا یقین دلا دیتا ہے۔ اور مجھے اس جنت کی کسی سے سند لینی ہے، نہ ٹکٹ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے وہیں سے اسی وکیل مرحوم کے کتب خانے سے آئی ہوئی ایک کتاب اور خریدی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس خط سے نپٹ نہیں لیتا، اس کتاب کو کھول کر دیکھوں گا بھی نہیں۔

اس خط کو میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ مجھے اسے اسی شخص تک پہنچانا ہے، جس کے لیے یہ لکھا گیا تھا۔ آخر ہر خط کوئی دوسرا ہی مکتوب الیہ تک پہنچاتا ہے۔ وہ دوسرا میں ہی سہی۔ آدمی کسی بھی مسئلے پر سوچنے لگے تو اس کا حل نکل ہی آتا ہے۔ شام تک مجھے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا راز معلوم ہو گیا۔

میں یہ خط شایع کر رہا ہوں، اس ڈھلمل یقین کے ساتھ کہ ہوسکتا ہے آپ ہی میں سے کسی کے لیے یہ خط لکھا گیا ہو۔ میں یہ خط پہلے پڑھ رہا ہوں تاکہ جب یہ چھپے تو پڑھنے والے کو کسی مقام پر الجھن نہ ہو۔ میں نے اسے رات گیارہ بجے ٹیبل لیمپ کے نیچے بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط بال پوائنٹ سے ایک جہازی سائز کے باریک کاغذ کے دونوں طرف لکھا گیا تھا، اس لیے اسے پڑھنے میں کچھ مشکل پیش آئی۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بھورا ہو چکا تھا۔ خط کی چار تہیں لگی تھیں، اور ایک تہ پھٹ گئی تھی۔ میں نے پہلے تو اسے گوند سے، اور اس سے زیادہ احتیاط سے ٹھیک کیا۔ ابھی میں نے اسے بس ایک نظر دیکھا تھا، اور لگا کہ میں اسے پڑھ سکتا ہوں۔ گو لفظوں کا املا آج کے املا سے مختلف تھا، بعض لفظ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ کئی مقامات پر اسے پڑھنا مشکل تھا۔ کاغذ کے باریک ہونے کی بنا پر کئی جگہوں پر ایک صفحے کے الفاظ دوسرے صفحے کے الفاظ پر چڑھ گئے تھے۔ کہیں سیاہی پھیل گئی تھی، جس سے لفظ موٹی سی لکیریں اور دھبے لگنے لگے تھے۔ خیر میں نے خط کو ایک سیاہ ٹائٹل کی کتاب پر رکھا اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا۔

بھائی صاحب!

Scanned with CamScanner

تم میرے خطوں سے بے زار رہتے ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں انھیں لکھنے کے بعد خود بھی بے زار ہو جاتا ہوں، اس سب سے جسے میں نے ان خطوں میں لکھا ہوتا ہے (مجھے اعتراف ہے کہ بیزار بڑا عام سا، بلکہ عامیانہ لفظ ہے۔ میں لکھنے کے بعد کئی طرح کی کیفیات سے گزرتا ہوں)۔ میرا معاملہ الٹا ہے [لفظ معاملہ مشکل سے پڑھا] ۔ اور لوگ لکھتے ہیں تو اطمینان محسوس کرتے ہیں، مگر میری بے اطمینانی بڑھ جاتی ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ جب میں لکھتا ہوں تو چیزیں زیادہ واضح ہو جاتی ہیں، اس لیے زیادہ بھیانک، زیادہ کریہہ، زیادہ شرمناک ہو جاتی ہیں۔ پتا نہیں لکھنے سے لوگوں کے زخم کیسے مندمل ہوتے ہیں، میرے پرانے زخم (الا ماشاء اللہ ان کا حد ہے نہ شمار) ہرے ہو جاتے ہیں، اور کبھی کبھی تو خاصے گہرے، نئے گھاؤ بھی لگتے ہیں۔ ویسے میں نے کئی بار خواہش کی ہے کہ کریہہ چیزوں کے سلسلے میں اپنے جذبات بدل لوں، لیکن اس میں کامیابی کے خیال ہی سے ڈر گیا۔ آپ کہیں گے ، چیزوں کے سلسلے میں جذبات کیسے بدلے جا سکتے ہیں۔ بھائی صاحب بدلے جا سکتے ہیں۔ جو چیز کریہہ لگ رہی ہے، اس کا نام بدل دو۔ چیزوں اور جذبات کے نام بدلنے سے بڑا فرق پڑتا ہے ۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ اگر میں نے کریہہ چیز کو کم کریہہ محسوس کیا، یا اس کے سلسلے میں لاتعلق ہو گیا تو..... [یہاں مجھے کافی مشکل آئی سمجھنے میں کہ آگے کیا لکھا ہے]....اسے لکھوں گا کیسے؟ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہوگی؟ خیر، اب تم تیار ہو جاؤ مزید بے زار ہونے کے لیے!

تم سے چند دن پہلے بات ہوئی تھی کہ شہر میں عورتوں کی آبروریزی کے واقعات کافی بڑھ گئے ہیں۔ حکومت کے سخت قوانین کا اثر نہیں ہو رہا۔ تم جانتے ہو حکومت کے پاس دماغ نہیں ہوتا، دل بھی نہیں ہوتا [اس پر میرے دل سے بے ساختہ داد نکلی] ، کوئی اور ہی صلاحیت ہے، جس سے حکومت کی جاتی ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جب مجرم کو سرِ عام پھانسی دی جاتی ہے تو اس سے جرم ختم نہیں ہوتا، بڑھتا ہے۔ حکومت اس بات کو کبھی نہیں سمجھے گی کہ لوگوں میں عبرت پکڑنے سے زیادہ، نقل کا مادہ ہے۔ یہ ایسا مادہ ہے جو بری باتوں کی نقل کرنے کے سو طریقے دریافت کر لیتا ہے۔ حکومت کے پلے یہ بات بھی نہیں پڑتی کہ لوگ ڈر سے جلد نکل آتے ہیں، مگر لذت کی خواہش سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ سب سے بڑا ڈر موت کا ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ سراسر وقتی ہوتا ہے، اور اسی پل

Scanned with CamScanner

جاگتا ہے جب آدمی خود اپنی یا کسی اپنے کی حقیقی موت کا سامنا کرے، اور ایسا کم کم ہوتا ہے، لیکن ہوتا یہ بھی وقتی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے نئی اور انوکھی تراکیب آزمانے کا شوق رہا ہے۔ میں نے عورتوں کی آبرو ریزی کو ختم کرنے کا ایک حل سوچا ہے، جسے تم آزمائشی کہہ سکتے ہو۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ میں مدت سے کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی مسئلے کا حل، اس مسئلے کو ننگا کرنے میں ہے۔ ہم لوگ ایک مسئلے کا تھوڑا سا حصہ دیکھتے ہیں، اور باقی سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اس تھوڑے سے حصے کو بھی جلد بھول جاتے ہیں، اور اس کی جگہ کسی دوسرے مسئلے کی ٹانگ، بازو، سرین [آگے کچھ الفاظ تھے، جو میں یہاں درج نہیں کرسکتا۔ اگر کسی کو جاننا ہو کہ وہ کیا ہیں، وہ میرے گھر آکر اس خط کا اصل متن پڑھ سکتا ہے] دیکھنے لگتے ہیں۔ مجھے تو سب لوگ تماش بین لگتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ میں ایک ناٹک تیار کروں، مگر جو کڑوا بھی ہو اور ذرا سا شیریں بھی، مطلب اس میں وہ سب سچ اور جھوٹ ہو، جو ہماری اصل زندگی کا دن رات حصہ ہوتا ہے۔ ایک خواجہ سرا سے میں نے بات بھی کرلی ہے، وہ اس ناٹک کا مرکزی کردار ہوگا، اور میرا خیال ہے یہ اس کی زندگی کی بہترین اداکاری ہوگی، جس کا انعام بدترین بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ آدمی کے عمل کی جزا سزا، عمل سے کم ہی مطابقت رکھتی ہے۔ اب ذرا توجہ سے میری بات پڑھنا، اور اسے پڑھتے ہوئے کوئی اور بات نہ سوچنا، جو تمھاری پرانی بری عادت ہے۔

[اس سے آگے خط میں اس ناٹک کی تفصیل لکھی گئی ہے، جس کا ذکر خط میں ہے۔]

یہ شہر کا سب سے مصروف چوک ہے۔ اس چوک پر بھانت بھانت کے سوداگر، دور دیسوں سے آتے ہیں۔ دن کو وہ اپنا اپنا مال بیچتے ہیں۔ شام کو انھیں تفریح چاہیے ہوتی ہے۔ کئی کھیل تماشوں والے جمع ہوجاتے ہیں۔ میں بھی ایک تماشا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نسوانی خصوصیات والے خواجہ سرا سے کہتا ہوں کہ وہ اپنا لباس اتار دے۔ میں اسے کچھ پیسے نہیں دیتا۔ میں اسے سمجھاتا ہوں کہ یہ سب ایک عظیم مقصد کے لیے ہے۔ وہ میری وضاحت سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس میں میرے باتونی ہونے کا کوئی کمال نہیں، (حالاں کہ میں باتونی ہوں)۔ اس کے اندر اایک بڑا اور بے غرض کام کرنے کا چھپا ہوا

Scanned with CamScanner

ارادہ تھا، جو بس اس لمحے ظاہر ہو گیا، جب میں نے اس کے سامنے اپنا خیال رکھا (آپ چاہیں تو میری زبان اور نیت کی صفائی کی داد سکتے ہیں)۔ وہ میرے کہنے کے مطابق الف ننگی ہو گئی (آگے تم بھی اسے عورت ہی سمجھنا)۔ شام کا وقت تھا۔ کہیں کہیں لیمپ جلنے لگے تھے۔ میں اس کے پاس کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہوں۔ حضرات! تمھارے سامنے ایک عورت کھڑی ہے۔ الف ننگی عورت۔ جوان، ننگی عورت۔ ان تھکے مگر مالا مال سوداگروں کے لیے اس میں تھوڑا سا نیا پن ہے۔ وہاں عورتیں شام ہی سے چکر لگاتی ہیں، اور گاہک تلاش کرتی ہیں۔ وہ بھڑ کیلے لباس میں ہوتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ چوک میں موجود سب مرد زندگی کی سب سے بڑی الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ بھڑ کیلے لباس کے پیچھے چھپے بدن کو نوچنا چاہتے ہیں، مگر انھیں رجھاتا سرخ، نیلا، کاسنی، سیاہ ریشمی لباس ہے۔ میں نے سوچا، وہ ایک الف ننگا بدن دیکھ کر اپنی اس الجھن سے نکل آنے کا دل میں دبا ہوا راستہ دیکھیں گے تو فوراً اس کی طرف بڑھیں گے، اور میں بھی اپنا مقصد حاصل کرلوں گا۔ میرا مقصد بڑا سادہ سا تھا کہ عورتوں کی آبروریزی کی خواہش کو ننگا کروں، انھی کے سامنے جو یہ خواہش رکھتے ہیں، مطلب سب مردوں کے سامنے، انھی کی خواہش کو سرتاپا عریاں کروں۔ (تم بھی قبول کرلو کہ تم میں بھی یہ خواہش ہے)۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص اس عورت کے ننگے بدن کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، کرے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ بھڑ کیلے لباس والی عورتوں نے ہم دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ہم ان کی مملکت میں دخل جو دے رہے تھے۔ میرا کردار، ایک دلال کا سا تھا، مگر اس طرح کا دلال انھوں نے نہیں دیکھا تھا، جس کے ہاتھ ہی میں مال ہو اور جس کی کوئی قیمت بھی نہ ہو۔ خیر، تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں کے گرد جم غفیر تھا۔ وہ سب کبھی مجھے دیکھتے، کبھی اسے۔ میرے چہرے کی طرف، اور اس کی چھاتیوں، رانوں، پیٹ، ناف، ناف سے نیچے، ناف کے پیچھے، غرض بدن کے سب اعضا کی طرف۔ لیمپوں کی روشنی زیادہ تیز نہیں تھی، اس لیے اس کے بدن کے کچھ حصے دودھیا لگ رہے تھے، اور کچھ سرمئی، اور کہیں کہیں تاریکی، اس کے کچھ حصوں کو شوخ بنا رہی تھی۔ میں ان سب کے دیکھنے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں اس لمحے کیا دیکھا، بتا نہیں سکتا۔ ان کی آنکھوں میں ان کے .... [میں نے پھر ایک لفظ حذف کیا ہے] گھس آئے تھے، اور جیسے آنکھوں سے نکل کر اس کے جسم تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے

محسوس کیا، کوئی طوفان آنے والا ہے، جو مجھے اور اسے تنکے کی طرح بہالے جائے گا۔ یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ طوفان آئے، جس کا مرکز خود انھی کا دل تھا، اور جس کی لپیٹ میں ہم سمیت وہ سب آنے والے تھے۔ اس نے میری بات مانی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اسی صبر سے کام لے رہی تھی، جو کسی بھی عظیم مقصد کو انجام دینے کی نیت کی عطا ہے۔ تاہم وہ کبھی آنکھیں جھکا لیتی، ایک نظر میری طرف دیکھتی، کسی کسی وقت ان سب پر ایک نظر ڈالتی۔

[یہاں تک پہنچ کر میں رک گیا۔ میں نے لیمپ بجھا دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو کیا کرتا؟ یہ سوال شاید ہر کہانی پڑھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ خیالی کہانیاں، حقیقی مسئلے مسائل کو سمجھنے کا اچھا ذریعہ ہوتی ہیں۔ میں نے ایک ہی نگاہ میں ہجوم، اس کے الف ننگے جسم اور اس شخص کو دیکھا جو اسے وہاں لایا تھا۔ میں اس سچ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ سب ذرا سا عجیب ضرور محسوس ہوا، مگر مجھے برا نہیں لگا۔ مجھے خواجہ سرا پر رحم ضرور آیا، مگر کافی دیر بعد۔ پہلے تو اس کے بدن کو، خاص طور پر مخفی اعضا کو دیکھنے کی شدید خواہش ہوئی۔ میں مانتا ہوں عورت کے ننگے جسم کو دیکھنے کی خواہش میرے اندر بھی چھپی ہوئی تھی۔ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ اس خواہش کا جنس سے تعلق ہے بھی اور نہیں بھی۔ میں جب عورتوں کو دیکھتا ہوں تو پہلا خیال ہی یہ آتا ہے کہ وہ کپڑوں کے بغیر کیسی ہوں گی۔ لیکن خواجہ سرا کے جنسی عضو کو دیکھنے کی شدید خواہش نے اچانک سر اٹھایا۔ پہلے میں نے سوچا یہ خواہش، اس خواہش سے ملتی جلتی ہے جو گلی سے گزرتے ہوئے کسی گھر کے کھلے دروازے کے اندر جھانکنے کی ہوتی ہے، یا جھک کر کام کرتی کسی عورت کے گریبان میں جھانکنے کی ہوتی ہے، مگر پھر مجھے لگا کہ نہیں خواجہ سرا کے عضو کو دیکھنے کی خواہش کہیں بڑی، اور کہیں زوردار تھی۔ یہ کسی اسرار کو جاننے کی خواہش تھی۔ مجھے اس سے پہلے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ سب میرے لیے اتنا بڑا اسرار تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں انسانی جسم کے سب اسرار کا رازداں ہوں۔ مجھے انسانی جسم کا تصور کرتے ہوئے کبھی خواجہ سرا کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس وقت اچانک ایک ہلکے سے احساس ندامت کے ساتھ، میں اس اسرار کو جاننے کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اندازے سے ایک خاکہ سا بنایا کہ .... کسی پرانے غسل خانے کی باہر کی طرف نکلتی

موری....ایک کونپل جو آناً فاناً بوڑھے سوکھے ڈنٹھل میں بدل جائے....اسی کے ساتھ ہی مجھے خواجہ سرا پر رحم محسوس ہوا۔ پھر اگلے ہی لمحے رحم کی جگہ، ایک الجھن نے لے لی۔ میں نے سوچا خواجہ سرا تو ہماری ہستی کی سب سے بڑی الجھن، ایک عظیم بکھیڑے اور سب سے زیادہ تشویش انگیز مخمصے کی نمائندگی کرتا ہے، یا کرتی ہے۔ ہم نہ پورے آدم ہیں نہ پورے وحشی۔ آدم بھی ہیں اور وحشی بھی۔ پورے آدم کی آرزو، وحشی بنا دیتی ہے، اور پورے وحشی بھی بس بنتے بنتے رہ جاتے ہیں....مجھے فوراً اپنی حماقت....اور اس سے بڑھ کر عیاری کا احساس ہوا۔ تف ہے مجھ پر، میں نے کس چالاکی اور عیاری سے .....یہ وہی چالاکی تھی جو مجھے انسانی جسم کا خیال کرتے ہوئے، خواجہ سرا کے جسم سے صرف نظر کرنا سکھاتی تھی .....البتہ عیاری نئی تھی.....خواجہ سرا کی زندگی سے آنکھیں بند کرلیں، اور اس پر احسان بھی دھر دیا۔ سچ یہ ہے کہ وہ ہمارے وجود کی الجھن کی علامت نہیں؛ کچھ ذہین لوگوں کی بری عادت ہے کہ وہ چیزوں کو علامت بنا کر انھیں چیز نہیں رہنے دیتے، انھیں کبھی حد درجہ مقدس بنا کر روزمرہ زدنیا سے باہر لے جاتے ہیں، اور کبھی کسی علم کا حصہ بنا دیتے ہیں جسے چند مخصوص لوگ ہی اپنی فرصت کے لمحات میں، ذہنی عیش کی خاطر پڑھ لیا کرتے ہیں....یہ عادت مجھ میں بھی کتابیں پڑھنے کے نتیجے میں در آئی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ خواجہ سرا کائناتی نغمے کا....اسی کائناتی نغمے کا جو ہم سب کے ملنے سے ترتیب پاتا ہے....وہ سر ہے جو ہماری بدذوقی....اور اس سے بڑھ کر... ہر چیز میں اپنی انا کی مداخلت کی عادت کی وجہ سے الجھا ہوا ہے....میں اگر وہاں ہوتا تو میں خواجہ سرا کی تعظیم میں سر جھکاتا۔ میں نے پوری سچائی سے خود سے کہا۔]

ایک شخص نے پہل کی۔ آگے بڑھا۔ اس کی چھاتیوں کو ہاتھ لگایا۔ ٹٹولا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ دوسرا شخص آگے بڑھا جس کے سر کے بال اور مونچھیں سفید تھیں۔ اس نے زیرناف حصے پر ہاتھ رکھا۔ میں یہ تمھیں بتانا بھول ہی گیا کہ اس نے خاصی محنت سے اپنی خواجہ سرائی کو چھپایا تھا۔ اس کے بعد کئی شخص آگے بڑھے۔ کسی نے اس کے سرین کو چھوا، کسی نے نازک حصوں میں انگلیاں چبھونے کی کوشش کی۔ کسی نے ہونٹوں کو چوما۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے زیرناف حصوں کو ہاتھوں سے مسلتے

ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس منظر کو دیکھ کر لذت یاب ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ ایک آدھ نے اس منظر کو ناپسند کیا، اور وہاں سے چلا گیا۔ مجمعے میں موجود کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے اس کے بدن کے کسی نہ کسی حصے کو چھیڑا نہ ہو۔ کچھ دیر اور گزری تو بڑی سیاہ مونچھوں مگر گنجے سر کا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے اسے پہلے بازوؤں میں بھرا، پھر بھینچنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ وحشیانہ تیزی سے اس کے جسم پر چل رہے تھے۔ مجمعے میں کھڑے لوگ اسے اکسا رہے تھے، آوازیں کس رہے تھے، اس کی وحشیانہ تفریح میں شریک ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی، اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، سانس اکھڑ رہا تھا، اور ڈکرانے جیسی آوازیں آ رہی تھیں، جس میں کچھ ملتجیانہ کراہیں مسلتی محسوس ہوتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تین لوگ اور آئے۔ ایک نوجوان تھا، اور باقی دونوں پچاس سے اوپر ہوں گے۔ وہ تینوں اس سے لپٹ گئے۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ گر پڑی۔ ان چاروں کے لیے آسانی ہوگئی۔ مجمعے میں بھانت بھانت کی آوازوں کا شور بڑھ گیا۔ وہ کسی انسانی مجمعے کا شور محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ جانوروں کی وحشیانہ آوازوں جیسا بھی نہیں تھا؛ وہ کچھ ایسی بے ہنگم، باہم گتھم گتھا، ایک دوسرے سے ٹکراتی اور زیر کرتی، اور ارد گرد کی ہر شے کو اپنی مجنونانہ نحوست کی لپیٹ میں لیتی آوازیں تھیں، جو شاید گھنے تاریک جنگلوں میں بسنے والے ان دیکھے غولوں کے غرانے سے پیدا ہو رہی تھیں، مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب پر ایک طلسم بن کر چھائی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ طلسم ٹوٹا۔ ایک قہقہہ آور، سخت نفرت آمیز طنزیہ آواز آئی کہ اس کی تو......نہیں ہے۔ سالی مخنث ہے۔ میں ڈر گیا۔ مگر اسی لمحے ایک بھڑکیلے لباس والی ڈھلتی عمر کی عورت جانے کہاں سے آ گئی۔ اس نے آناً فاناً اپنا لباس اتارا اور چیخ کر کہا، لو مجھے بھی کھسوٹو، میں اب بھی جوان ہوں۔ اس کی آواز میں درد، احتجاج اور باقاعدہ دعوت سب کچھ ملا جلا تھا۔ ادھر لوہا گرم تھا۔ چناں چہ کچھ ڈھلتی عمر کے مرد اس کی طرف بڑھے، البتہ دو ایک نوجوان فاصلے پہ جا کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ میں ان کے ردّعمل کو دیکھتا، آناً فاناً ایک نئی بات ہوئی۔ سوداگروں اور سوداگر زادوں نے اس پر پیسے نچھاور کرنے شروع کر دیے۔ پھر تو بھڑکیلے لباس والی کئی عورتیں، جو اس ساری صورت حال کو حیرت، خوف اور ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھیں، اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے آ گئیں۔ میری خواجہ سرا چوں کہ

Scanned with CamScanner

پیسے نہیں لے رہی تھی ،اس لیے اسے سب بھول بھال گئے۔سب ان عورتوں میں پوری دل جمعی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ پیسہ ظالم چیز ہے۔ یہ ہر شے کا نعم البدل بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر انسانی عمل اور خیال کا بھی۔عمل خواہ کتنا بھیانک ہو، خیال خواہ کتنا شر انگیز ہو، یا کتنا ہی اعلیٰ ہو، پیسہ اس کا بدل بن جاتا ہے۔تم نہیں مانو گے، زیادہ کتابیں پڑھنے والے اور مبلغین بھی نہیں مانتے، مگر یہ سچ ہے کہ پیسہ، ان سب آوازوں کو بھی چپ کرا دیتا ہے، جو ایک بھیانک عمل پر احتجاج کرتی ہیں۔ جب وہ خواجہ سرا کو چھیڑ رہے تھے تو کہیں نہ کہیں ان کے اندر ایک کھد بد چل رہی تھی، جو ان کی لذت اندوزی میں تھوڑی بہت کھنڈت ڈال رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ خود سے جھگڑتے محسوس ہوتے تھے، ایک کانٹے کو ہستی کے ان نازک مقامات پر چبھتا محسوس کرتے تھے، جہاں زخم گہرا لگتا ہے، اور بھرتا بھی نہیں۔ میں ان کے اندر کی کھد بد کو ایک نا قابل برداشت دہشت تک پہنچانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کانٹا اور زیادہ گہرا زخم لگائے۔ میں ان کے اس احساس کو اس آخری حد تک پہنچانا چاہتا تھا، جس آخری حد کا خیال کرتے ہی یہ لوگ اپنے اپنے خداؤں کی طرف پلٹ آتے ہیں، پیسے کی طرف، مندر مسجد کی طرف....میں انھیں اس آخری حد تک لے جانا چاہتا تھا، جہاں پہنچ کر تمام احساسات دہشت انگیز ہو جاتے ہیں.....اور جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگتے ہیں، وہ جہنم جسے یہ خود لیے لیے پھرتے ہیں، مگر اس میں دوسروں کو لا پھینکنے کی سازش کرتے رہتے ہیں...اور جہاں پہنچ کر اپنے اپنے خداؤں کی طرف پلٹنے کا راستہ اسی جہنم میں گم ہو جاتا ہے...مگر.....ظلم ہوا۔ سب سے بڑا ظلم اس خواجہ سرا پر۔[یہاں خط ختم ہو گیا]

Scanned with CamScanner

فرشتہ نہیں آیا

اسے لگا کہ جیسے کسی نے اس کے سر پر پتھر دے مارا ہے۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے سر سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں تیر گئی۔ بابا، شنی...اس کے منھ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ وقت کا وہ ایک عجب حصہ تھا، جس کا اندازہ کرنے سے وہ قاصر تھی، وہ لمحہ تھا یا سال، اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ شاید وہ وقت سے باہر نکل گئی تھی۔ پھر اسے لگا کہ اس پتھر کی چوٹ اسے دوبارہ لگی ہے۔ خودکار طریقے سے اس کا ہاتھ سر کی طرف گیا۔ ہاتھ گیلا ہو گیا۔ خون رس رہا تھا۔ کہیں کہیں جم گیا تھا۔ سر کے بال سخت سے ہو گئے تھے۔ گردن کے پچھلے حصے پر اکڑن سی محسوس ہوئی، اور لگا کوئی جیسے اس کے بال کھینچ رہا ہے۔ وہاں بھی خون جما ہوا تھا، جس پر مٹی کی تہ چڑھ گئی تھی۔ دائیں طرف کھوپڑی میں گہرا گھاؤ تھا۔ چہرے پر بھی جیسے کوئی شے بری طرح کاٹ رہی تھی۔ کئی خراشیں وہاں آئی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ گر پڑی۔ اس کا ڈر بڑھ گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ شنی کے اوپر گری تھی۔ اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کتنی دیر لگی، یہ پہچاننے میں کہ وہ کہاں ہے۔ جیسے ہی اسے لگا کہ وہ اور شنی کسی اندھی کھائی میں ہیں، اس نے بری طرح رونا شروع کر دیا۔ بابا، بابا، بابا۔ وہ کافی دیر روتی رہی۔ جب کہیں سے کوئی آواز سنائی نہ دی تو اس نے مزید شدت سے رونا شروع کر دیا۔ پھر معلوم نہیں کتنی دیر بعد.... بابا، بابا کہاں ہیں؟ کہتے کہتے وہ تھک گئی....تو اس نے دیکھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے، اور کچھ کہہ رہا ہے۔ اس کی صورت نظر نہیں آتی، آواز سنائی نہیں دیتی، مگر اس کے ننھے، سہمے دل میں یقین پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ہے وہاں، اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک روشنی کی

Scanned with CamScanner

لہر وہاں سے تیزی سے گزری۔ اسے لگا کہ وہ اس کی اماں ہیں۔ اسے اماں کا چہرہ ٹھیک طرح یاد نہیں آتا تھا، مگر دادی کی باتیں سن سن کر اس کے ذہن میں ان کا ایک نقش سا بن گیا تھا کہ ان کے بالوں کا رنگ بھورا تھا، اور چہرہ کافی گورا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ اس کے بابا، بابا، بابا کی کراہ سن کر وہاں پہنچی ہیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے سر کی چوٹ سے بہنے والے خون کو بھول گئی۔ وہ اٹھی۔ اندھیرے میں اس شے کو ٹٹولا جس پر وہ ابھی ابھی گری تھی۔ کوئی نرم سی چیز محسوس ہوئی۔ جوں ہی اس کا ہاتھ اس کے ٹھنڈے چہرے کو چھوا، اسے جاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ شنی تھی۔ اس نے شنی کا ہاتھ پکڑا، اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر لگتا تھا جیسے اس کا وزن بڑھ گیا ہے۔ وہ اسے کئی مرتبہ اٹھالیا کرتی تھی، اور وہ دونوں ہنسا کرتی تھیں۔ اس نے ہمت نہیں ہاری، دوبارہ اسے اٹھانے کی کوشش کی، مگر لگتا تھا وہ گہری نیند میں ہے۔ اس نے پہلے اسے جگانے کی کوشش کی، اسے پکارا، بار بار پکارا، اسے جھنجھوڑا، اس کے بال تک کھینچے، مگر اس کی نیند تھی کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اس نے پہلی بار اوپر کی طرف دیکھا۔ تارے جھک آئے تھے، اور دو تین ستارے بے حد روشن نظر آنے لگے تھے۔ ادھر ادھر دیکھا، کچھ سجھائی نہ دیا۔ ہاتھوں کو ہبڑ دبڑ اِدھر اُدھر پھیرا تو پتا چلا جھاڑیاں ہیں۔ کچھ کانٹے اس کے ہاتھوں میں چبھے۔ وہ ایک بار پھر ڈر گئی، اور رونے لگی، اس مرتبہ اس نے اماں، اماں پکارنا شروع کیا۔ خود اسے اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ اور اونچا رونے لگی۔ اچانک اس نے ایک آواز سنی، جو کسی جانور کی تھی، مگر وہ اس سے واقف نہیں تھی۔ اس نے رونا بند کیا۔ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی، جس میں کھڑ کھڑاہٹ بھی شامل تھی۔ اسے لگا کوئی اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس طرح کی اچانک صورتِ حال سے نکلنا تو دور کی بات، اسے سمجھنے کا بھی اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ اس پرندے کی طرح تھی جس کے پر لمبے، خشک نوکیلے کانٹوں میں الجھ گئے ہوں اور درد کی شدت کا یہ عالم ہو کہ اڑنے کا خیال بھی نہ آتا ہو۔ کھڑ کھڑاتی چاپ قریب آتی جارہی تھی۔ پرندے نے جیسے پروں کے بغیر اڑنے کی ترکیب پر غور شروع کیا۔

ایک کہانی اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی۔ دادی اماں نے کچھ ہی عرصہ پہلے اسے ایک کہانی سنائی تھی۔ شہزادی کی عمر دس سال ہوئی تو وہ ایک روز ایک بلی کا پیچھا کرتے، راستہ بھٹک

Scanned with CamScanner

گئی، جنگل میں پہنچ گئی۔ رات ہوئی، جنگل میں شہزادی اکیلی تھی۔ ایک درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ رو رہی ہے، اپنے آپ میں سمٹی ہوئی ہے۔ شیر کی گرج سنائی دی تو لگا جیسے اس کا دل سینے سے باہر اچھل پڑے گا۔ تنے کو پکڑ کر درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تو کیا ہوا کہ ایک فرشتہ آیا۔ اُن کے سفید پر ہیں، جو چمک رہے ہیں، اس نے شہزادی کا ہاتھ پکڑا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے گھر میں اپنے بستر پر تھی۔ اس نے سوچا ابھی ایک فرشتہ آئے گا۔ ان دونوں کا ہاتھ پکڑے گا اور بابا کے پاس لے جائے گا۔ اسے خیال آیا کہ شنی جاگے گی نہیں تو وہ کیسے فرشتے کا ہاتھ پکڑے گی۔ اس کا حل اس نے ایک سیکنڈ میں سوچ لیا: میں اسے اٹھا لوں گی۔ اسی لمحے اس نے شنی کو اٹھانے کی کوشش کی، گرتے پڑتے اسے اٹھا لیا، مگر فرشتہ نہیں آیا۔ کھڑکھڑاتی چاپ کہیں دور جا چکی تھی۔

بابا، بابا کہاں ہیں؟ ماموں.....وہ پھر رونے لگی۔ روتے روتے وہ جھکی، شنی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا، اسے اٹھایا۔ اس کے جسم پر گوشت کم اور ہڈیاں نمایاں تھیں۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ اسے بائیں کاندھے سے لگایا اور دائیں ہاتھ سے ایک ٹہنی پکڑی، موٹا سا کانٹا اس کے ہاتھ میں چبھ گیا۔ وہ پیچھے کی طرف گر پڑی۔ شنی کا سر پیچھے کسی شے سے جا لگا۔ اس نے کراہتے ہوئے، ہاتھ سے کانٹا کھینچ کر نکال پھینکا۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی، اور خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی، جس کا احساس اندھیرے میں اسے یوں ہوا جیسے کسی نے نیم گرم دودھ اس کی ہتھیلی پر گرا دیا ہو۔ اگلے ہی لمحے اسے شنی کا خیال آیا۔ اسے دوبارہ اٹھایا، ٹٹولا، کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ جہاں اس کا سر لگا تھا، وہاں صرف مٹی تھی۔ اس کے بالوں میں مٹی پڑ گئی تھی۔ اس نے مٹی جھاڑی۔ پھر ہمت کی۔ اس بار اس نے کھائی کے دوسرے حصے پر پہلے آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ جب اطمینان ہوا کہ وہاں کانٹوں والی جھاڑیاں نہیں ہیں تو شنی کو اٹھا کر اوپر جانے کی کوشش کی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ بار بار پاؤں رپٹ رہا تھا، کسی وقت لگتا کہ شنی گر پڑے گی، کسی وقت لگتا کہ وہ دونوں پیچھے کی طرف دھڑام سے گر پڑیں گی۔ اس کا سر شدید درد کر رہا تھا۔ جیسے تیسے گرتے پڑتے وہ دونوں کھائی سے باہر آنے میں کامیاب ہوئیں۔ اسے یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا کہ اسے کھائی سے باہر آنے میں کتنا وقت لگا۔ البتہ جب وہ باہر آئی تو محض ایک ثانیے کے لیے ایک خیال اس کے ذہن میں تیر گیا، جب اس نے پیچھے مڑ کر کھائی میں جھانکا، جو پانچ چھ فٹ گہری تھی: فرشتہ تو

نہیں آیا مگر اماں ضرور آئی ہوں گی۔ اماں نہیں تھیں تو بابا تھے، بابا.... اسے یاد آیا.... وہ بابا کی انگلی پکڑ کر شام کو گھر سے نکلی تھی۔ وہ دونوں بہنوں کو ان کے ماموں کے پاس لے جا رہے تھے۔ بابا... کہاں چلے گئے..... ابھی تو شنی ان کے کاندھے پر تھی، اور وہ ان کی انگلی پکڑ کر چل رہی تھی..... چلتے چلتے اسے نیند سی محسوس ہوئی تھی.... بابا، بابا، کہاں چلے گئے ہو....

وہ شنی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے اس کھائی سے باہر نکلی تو صبح کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی جنگلی جھاڑیاں ہیں۔ کہیں کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اس قسم کی جھاڑیاں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کے گاؤں میں شیشم، کیکر، نیم اور برگد کے بڑے بڑے درخت تھے، کپاس، گندم، چاول، گنے، مکئی، جوار، باجرے، مکی کی فصل ہوا کرتی تھی اور انھی میں کچھ خودرو جھاڑیاں ہوا کرتی تھیں، یا برسین، لوسن جیسے چارے کے کھیت ہوا کرتے تھے، مگر یہ چھوٹی چھوٹی نوکیلی خشک جھاڑیاں تھیں، جن پر پتے نہ ہونے کے برابر تھے، اور چھوٹے چھوٹے بیر نما پھل تھے۔ وہاں کی زمین بھربھری تھی۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ سرمئی رنگ کی فاختائیں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ بھورے رنگ کی چڑیاں تھیں جو اس کے آس پاس اڑنے لگی تھیں، اور اونچی آواز میں چوں چوں کرنے لگی تھیں، جیسے وہ بے چین ہوں اور تذبذب کا شکار ہوں۔ وہ دونوں بہنیں اس لمحے ان کی آبادی میں ایسے اجنبیوں کی طرح تھیں، جن کے بارے میں ان کے ننھے دماغ کوئی واضح اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک نامعلوم طریقے سے، وہ ان چڑیوں کی بے چینی اور خوف کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے شنی کو جگانے کی ایک مرتبہ پھر بہتیری کوشش کی۔ اسے انجانے خطرے کا احساس ہوا۔ اس لمحے میں وہ جس دنیا میں تھی، جن جھاڑیوں، جن پرندوں کے درمیان تھی، وہاں سب کچھ اچانک، کسی انوکھی طاقت کے تحت خود اپنا، اپنے وجود کا، اپنے معنی کا انکشاف کرتا ہے۔ اس سے وہاں موجود سب چیزوں میں برابری کا وہ رشتہ قائم ہوتا ہے جسے انسانی آبادیوں میں رہنے والے شاید ہی سمجھتے ہوں۔ سب ایک دوسرے کو، اپنی اپنی زبان میں سمجھ رہے ہوتے اور بے خطا عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک بات شنی پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ وہ انسانی آبادی سے دور کر دی گئی ہے۔ وہ ہم جنسوں کی دنیا سے بے دخلی کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی تھی، نہ اچانک آ پڑنے والی افتاد سے نمٹنے کی تیاری اس نے کر رکھی تھی۔ اسی لیے اس کی حسیات معمول

سے زیادہ تیزی سے کام کررہی تھیں اور ماحول کی ہیبت نے انھیں ایک دوسری سے غیر معمولی تعاون پر مجبور کردیا تھا۔ کسی پر خطر صورتِ حال کے سلسلے میں اس کی ناتجربہ کاری اس کے کام آرہی تھی۔ اس کے تمام حواس پوری طرح بیدار اور ایک دوسرے کے دست و پا بنے ہوئے تھے۔

اس کے ہاتھوں کی پوروں، اس کی آنکھوں، اس کے کانوں اور اس کے سوجے پاؤں نے ایک ہی بات محسوس کی کہ اس بنجر زمین کی جھاڑیوں، پرندوں، ہواؤں کی زبان اجنبی نہیں ہے۔ اس نے ان چڑیوں کی بے چینی کو سمجھا۔ وہاں سے جلد سے جلد نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور وہاں سے باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟ اسے ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ اس نے سوچا میرے سر پر شور مچانے والی چڑیاں جس سمت کو مڑیں گی، اور زیادہ دیر تک اسی طرف اڑتی چلی جائیں گی، میں بھی اسی طرف چل پڑوں گی۔ وہ جب تک رکی رہی، چڑیاں اس کے سر پر چکر لگاتی رہیں، اس نے کسی نامعلوم احساس کے تحت جوں ہی ایک طرف دو قدم بڑھائے، چڑیوں نے اس کے الٹ سمت میں اڑنا شروع کیا، اور ایک لمبی قوس بناتی ہوئی واپس آئیں۔ وہ اسی طرف چل پڑی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اب چڑیاں اس کے سر پر نہیں اڑ رہی تھیں۔ وہ پرسکون ہو کر غائب ہوگئی تھیں۔ وہ چلتی رہی، سر کی چوٹ کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے، کہیں روتے، کہیں سسکتے، کہیں چپ ہوتے۔ زمین بھربھری تھی، جگہ جگہ چھوٹی بڑی کھائیاں تھیں اور جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں۔ اس کے پاؤں کہیں بھربھری مٹی میں رپٹ جاتے، کہیں دھنس جاتے، جہاں کانٹے بھی موجود ہوتے۔ جب کئی کانٹے پاؤں کے تلووں میں چبھے تو اسے خیال آیا کہ وہ جوتا تو وہیں کھائی میں بھول آئی ہے۔ کانٹے دار جھاڑیاں اس کے کپڑوں سے بھی الجھ رہی تھیں۔ ایک مرتبہ تو اس کی قمیص سے ایک جھاڑی کی خشک کانٹوں بھری شاخ اس طور الجھی کہ وہ شنی سمیت اس پر گرتے گرتے بچی۔ اسے اب شنی پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ کس مزے سے سو رہی تھی، اور اس کے لیے مصیبت بنی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ اسے پہلی مرتبہ بابا پر بھی غصہ آیا کہ وہ کہاں رہ گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سوچا کہیں وہ کسی دوسری کھائی میں نہ گرے ہوں۔ اس نے واپس اسی جگہ جانے کے لیے مڑنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اسے سامنے، کچھ فاصلے پر ایک آدمی نظر آیا۔ اسے لگا وہ بابا ہی ہیں۔ وہ بابا، بابا کہتی اس کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کا پاؤں

Scanned with CamScanner

رپٹا، اور اگلے ہی پل وہ کانٹوں بھری جھاڑی پر تھی۔ شنی اس کے کاندھے سے پھسل کر آگے منھ کے بل جا گری تھی۔ اس لمحے اس نے دو چیزوں کو فی الفور محسوس کیا۔ درد کی ایک نئی شدت، اور اپنے اوپر چڑیوں کا ایک غول جو ذرا مختلف آواز میں شور برپا کیے ہوئے تھا۔ کئی کانٹے بہ یک وقت اسے چبھے۔ ایک دائیں بازو میں، کچھ سینے میں، کچھ رانوں میں اور پنڈلیوں میں۔ آنکھیں زخمی ہونے سے بچ گئی تھیں۔ اس نے اسی جھاڑی کی ایک ٹہنی کو پکڑا، جس پر کانٹے نہیں تھے، اپنی ساری ہمت جمع کی، اٹھنے لگی، جسم سے کانٹے نکلنے لگے تو درد کی ایک نئی لہر سارے جسم میں تیر گئی۔ اسے لگا جیسے وہ کانٹے سارے جسم میں کھب گئے ہیں۔ جیسے ہی اس کی نظر سامنے شنی پر پڑی، جو اوندھے منھ اسی بھربھری مٹی میں پڑی تھی، وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، خون کی کئی دھاریں بہ یک وقت بہ پڑیں۔ اسے ایک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اسی لمحے اس نے دیکھا کہ چڑیاں اس کے اوپر چکر لگا رہی ہیں، اور ایک خاص آہنگ میں چوں چراچوں، چراچوں، چوں چوں، چراچراچرا، چوں ں ں ں کر رہی ہیں۔ اسے اشارہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ اس جنگل کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔ وہ اس کی طرف دوڑی۔ جس وقت وہ شنی کی طرف چھلانگ سی لگا کر پہنچی، ٹھیک اسی لمحے اس نے محسوس کیا کہ اسے ایک نئے مہیب مرحلے کا سامنا ہے، اور جانے کیسے اس نے ایک پل کے ہزارویں حصے میں یہ راز پالیا کہ ایک خالی ہاتھ، دس سال کی زخموں سے چور لڑکی کے پاس ابھی ایک ہتھیار ہے عناصر کے خلاف جدوجہد کا۔ اس نے پوری طاقت جمع کر کے چیخ ماری۔ جنگل گونج اٹھا، اور چڑیاں پریشانی کے عالم میں اڑتی نظر آئیں۔ شنی کی طرف بڑھتا جانور بھاگ گیا۔ وہ بھیڑیا تھا۔ اس نے شنی کو اپنی زخمی بانہوں میں بھرا۔ اٹھایا۔ اس کا چہرہ مٹی میں لت پت تھا۔ مٹی اس کی آنکھوں میں تھی، منھ میں تھی، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر سخت فکرمند ہوئی کہ شنی نے مٹی کو اپنی آنکھوں اور منھ میں محسوس تک نہیں کیا تھا۔

جس آدمی کو اس نے بابا سمجھ کر آواز دی تھی، وہ اب کافی دور چلا گیا تھا۔ وہ اسی سمت میں بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، جسم سے خون رس رہا تھا، زبان سے بابابابا، اماں اماں، دادی دادی کے الفاظ تھے۔ یہ الفاظ ٹوٹ جاتے تھے، اس سسکیوں میں ڈوب جاتے تھے، گم ہو جاتے تھے، پھر اچانک ابھرتے تھے۔ یہ چند لفظ اسے امید دلاتے تھے کہ اس دنیا میں، جو اس وقت خون،

خوف، بھوک پیاس، تھکن، کانٹوں، موت کا دوسرا نام تھا، کوئی ہے جو اسے اس دنیا سے باہر لے جائے گا، واپس اسی دنیا میں جہاں سے وہ کل رات بابا کے ساتھ نکلی تھی۔ اسے ایک بار پھر بابا یاد آئے....

اسے نہیں معلوم وہ کتنا عرصہ چلتی رہی، کہاں کہاں گری، کہاں کہاں کانٹے چبھے۔ اس نے دیکھا کہ دو تین چڑیاں مسلسل اس کے سر پر آتی ہیں، وہی مانوس سی چوں چراچوں کرتی ہیں، اور آگے جاتی ہیں، پھر واپس آتی ہیں۔ اسے اگر وہاں سے نکلنے میں کسی نے مدد دی، اور اسے راستہ دکھایا تو وہ یہی چڑیاں تھیں، اس نے سوچا۔ کہیں کہیں فاختائیں اور کوے بھی تھے، کوئی کوئی چیل بھی اڑتی نظر آتی تھی۔

وہ ان کانٹوں بھری جھاڑیوں سے نکل آئی تھی، اور ایک کچے راستے پر چل رہی تھی۔ روتے روتے اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ نیزہ بنی ہوئی تھی۔ خون اس کے کپڑوں پہ تھا، گردن اور بازوؤں پر جم چکا تھا، جس پر مٹی کی تہ تھی۔ اس کا جسم بے حس ہو چکا تھا، اور وہ سوچنے سے قاصر تھی۔ مشینی انداز میں چل رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کچھ بڑے پرندے اس کے سر پر چکر لگانے لگے تھے۔ وہ اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شدید ہیبت محسوس کی، اور اس کے بے حس ہوتے جسم نے جھرجھری لی۔ اسے لگا کہ وہ پھر ایک عظیم خطرے کی زد میں ہے۔ اس نے کسی قدیمی جبلت کے تحت خطرے کو تو بھانپ لیا، اور وہ مشین سے ایک ایسا زندہ وجود بن گئی، جسے اپنی بقا کا سوال درپیش ہو، مگر خطرہ کیا تھا، اسے فوراً نہ سمجھ سکی۔ اس نے شنی کو کاندھے سے اتار کر ایک جگہ زمین پر لٹایا۔ اگلے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ سامنے ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہے، جس پر گوشت دھجیوں کی مانند کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ تبھی ایک گدھ وہیں قریب آ کر اترا، کئی گدھ پہلے سے موجود تھے۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے کسی مرے ہوئے آدمی کے بدن کو نہیں چھوا تھا۔ چھ سال پہلے جب اس کی اماں مری تھیں، تب وہ چار سال کی تھی۔ ماں کی موت کا خیال کرتے ہی اس کے ذہن میں بس دو دھندلے سے منظر آتے تھے: ایک چارپائی کے گرد عورتیں بیٹھی بین کر رہی ہیں، اور چارپائی کو کئی لوگ گھر سے باہر لے جا رہے ہیں، اور اچانک رونے اور بین کی آوازیں اتنی اونچی ہو جاتی ہیں کہ وہ بری طرح ڈر گئی تھی، اور دوڑ کر دادی کے پاس چلی گئی تھی، جس کی گود میں چند دنوں کی شنی تھی۔ وہ نیند اور

Scanned with CamScanner

موت میں فرق کا احساس رکھتی تھی، مگر اس فرق کو پہچاننے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ شنی سوئی ہوئی تھی، یا بے ہوش تھی۔ یوں بھی شنی ہمیشہ گہری نیند سونے کی عادی تھی، چارپائی پر دھوپ آجاتی تب بھی پڑی رہتی تھی۔ وہ کئی دفعہ اسے تھپڑ مار کر جگایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو غصے میں اس پر پانی بھی گرا دیتی تھی، اور شنی اٹھتے ہی رونے لگتی، یوں بھی مسلسل بیمار رہنے کے سبب وہ چھوٹی چھوٹی بات پر دیر تک روتی رہتی تھی۔ اس نے گدھوں کو اپنی بستی کے مردہ جانوروں پر منڈلاتے اور ان کی بوٹیاں نوچتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ انھیں بھگایا بھی کرتی تھی۔ ''میں شنی کو ان کے حوالے نہیں کروں گی''۔ اس نے دل میں تہیہ کیا۔ اس نے اسے اٹھایا اور تیز تیز چلنے کی کوشش کی۔ تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ اسے لگا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے۔ ایک لمحے کے سوویں پل میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اور شنی ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں، جن کا گوشت گدھ نوچ چکے ہیں۔ اسی ثانیے میں، اس نے فیصلہ کیا۔ اس نے اس کچے راستے کے دائیں جانب دیکھا، وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ اس نے شنی کو اس میں پھینکا، اور اس پر مٹی ڈالنے لگی۔ وہ اپنی ہتھیلیوں سے ادھر ادھر سے مٹی کھود رہی تھی، اور اس پر اندھا دھند ڈال رہی تھی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ شنی کی آنکھوں میں اور منہ میں مٹی چلی جائے گی تو اس نے ہاتھ روک لیا۔ وہ اسے اٹھانا چاہتی تھی، اور سینے سے لگا کر کچھ کہنا چاہتی تھی.....شنی.....اس.....جگ.....میں..... ہم.....دو.....صرف.....ہی تو ہیں۔ لیکن اسی وقت اس نے گدھوں کو دوبارہ دیکھا جن کی موٹی، بھدی چونچوں میں مردہ گوشت کے ٹکڑے تھے، وہ چہلیں کر رہے تھے، لڑ رہے تھے اور منحوس سی آوازوں میں اس جنگل کو..... یا شاید اسے..... یا شاید دنیا کو کوئی پیغام دے رہے تھے۔ اس نے دھڑا دھڑ اس پر مٹی ڈالی۔ وہ چھپ گئی تھی۔ مٹی کی ایک ڈھیری سی بن گئی تھی۔ اسے کچھ اور نہیں سوجھا، اس نے مٹی اٹھائی اور اپنے سر میں ڈالی، سینے پر دوہتڑ مارے، اور مٹی کی اس ڈھیری کو گلے لگا لیا۔ پھر اسے کچھ خبر نہ رہی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اسے سر میں ناقابل برداشت سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اسے لگا کوئی شے اس کا بھیجا کھا رہی ہے۔ بے اختیاری کی حالت میں اس کا ہاتھ سر کے زخم تک پہنچا۔ وہ زخم کو کھجانے کی شدید طلب محسوس کرنے لگی، اس سے رہا نہیں گیا۔ زخم سے خون رسنے لگا۔ اس کی نگاہ ہاتھ

Scanned with CamScanner

پر پڑی تو کئی چیونٹیاں خون کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے لگا اگر وہ یہاں مزید رکی تو یہ چیونٹیاں اسے کھا جائیں گی۔ اس نے شنی کی اپنے ہاتھوں بنائی قبر کو ایک نظر دیکھا اور چل پڑی۔ وہ سخت تکلیف محسوس کرنے کے باوجود زخم کو چھیڑتی تھی، اور وہاں سے چیونٹیاں کھینچ نکالتی تھی، اور ایک ہلکی سی لذت محسوس ہوتی تھی، جو تکلیف کو گوارا بناتی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ بار بار آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھا رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے گر پڑتی تھی۔ وہ کل رات سے بھوکی پیاسی اور زخموں سے چور تھی۔ اسے اردگرد، آس پاس کسی شے کی خبر نہیں تھی، وہ بس چل رہی تھی۔ اس میں اس کے ارادے، اس کے ذہن کو دخل نہیں تھا۔ کچھ اور تھا جسے وہ نہ تو سمجھنے کے قابل تھی، نہ اس وقت اس کی طرف توجہ کرنے کی اس میں تاب تھی، جس کی زنجیر سے بندھی وہ گرتی پڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس نیم مردہ وجود میں کوئی ایک موج سی تھی، جو عناصر کے خلاف مزاحمت کر رہی تھی، اور جو بدترین حالات میں بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھی، لیکن اس وقت وہ اس کے زیرِ اثر تھی، اس کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ راستے میں ایک درخت آیا۔ وہ سوچے بغیر اس کے تنے کے پاس ڈھ سی گئی۔ اس نے خود پر نیند کا شدید غلبہ محسوس کیا، مگر اسی موج نے اس کے خلاف مزاحمت کی۔ اس نے درخت کے نیچے ٹھنڈ محسوس کرتے ہی طاری ہونے والی نیند کو روکا۔ اسے بس ایک پل کے لیے محسوس ہوا تھا کہ درخت کی وہ ٹھنڈ اسے دھوکا دینے والی ہے۔ وہ نیند کا دھوکا دے رہی ہے، نیند نہیں ہے۔ اس نے درخت کی سخت چھال کو کھینچا، چرررر کے آواز کے ساتھ چھال کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا، اور ہتھیلی کو زخمی کر گیا۔ کھردری چھال کا ایک نوکدار ٹکڑا ہتھیلی میں چبھا، درد کی ایک کاٹتی لہر جسم میں پھیلی تو وہ پوری طرح جاگ گئی۔ چھال، باہر سے سخت اور خشک تھی، اور اندر سے نرم اور تر تھی۔ اس نے اسے چبانا شروع کر دیا۔ اسے مدھم سا، کہیں دور بہت دور چمکتے ستارے کی طرح احساس ہوا کہ، وہ اس جامن کے درخت کی چھال نہیں تھی، جس کے تنے سے لگ کر وہ نیم جاں حالت میں بیٹھی تھی، وہ کسی اور دنیا، شاید بہشت کے باغ کا کوئی درخت تھا۔ بہشت، جس کے بارے میں دادی بتاتی تھی کہ جہاں اس کی اماں رہتی ہے۔ وہ تیری بہشتن ماں کہہ کر اس کی اماں کا ذکر کرتی تھیں، اور بتاتی تھیں کہ بہشت میں وہ سب طرح کے پھل ہوتے ہیں، جنھیں ہم یہاں کھانے کو ترستے رہتے ہیں۔ اس قدر شیریں، اتنا رسیلا، اس درجہ خوش ذائقہ، دنیا کا کوئی درخت نہیں ہوسکتا، اس

نے محسوس کیا۔ وہ اس کو جیسے جیسے چباتی جا رہی تھی، اسے لگ رہا تھا کوئی لہر سی اس کے بدن میں دوڑ رہی ہے، اور اسے اس قابل بنا رہی ہے کہ وہ دیکھ سکے کہ کہاں ہے، کس حالت میں ہے۔ اس کے سامنے کچھ جامن گرے پڑے تھے۔ اس نے ہبڑ دبڑ اٹھائے، منہ میں ڈالے۔ گٹھلیوں سمیت کھاتی چلی گئی۔ اب اسے گلے میں خراش کے ساتھ سخت پیاس محسوس ہوئی۔ اٹھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مشکل سے گرتے گرتے بچی۔ سر کو جھٹکا دیا۔ آنکھوں کی پتلیوں کو پھیلایا، جتنا پھیلا سکتی تھی۔ بار بار آنکھیں جھپکیں، اور پھیلائیں۔ یا اللہ.... اس نے پہلی مرتبہ اوپر دیکھ کر بے ساختہ کہا.... دوبارہ اٹھی، اب بھی سر چکرایا، تنے کو پکڑ لیا، اور چلنے کی ہمت باندھی۔ وہاں چارے کے کھیت تھے، اور جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ وہ کھیتوں کے بیچ مینڈھ پر احتیاط سے قدم رکھتی چلی جا رہی تھی۔ جسم میں تھوڑی سی توانائی آئی تھی، اور اس کے ساتھ ہی سارے بدن میں درد، تھکن، لاغری اور وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کچھ کچھ مانوس لگیں۔ چڑیوں، طوطوں اور فاختاؤں کی آوازیں تھیں۔ اس کی وحشت کچھ کم ہوئی۔ وہ ایک جگہ رکی، اور آم کے درخت کی ایک شاخ کو دیکھنے لگی، جہاں کچھ طوطے بیٹھے تھے، اور اس کا پھل کچر کچر کھائے جا رہے تھے۔ ادھ کھائے پھل نیچے گرتے تھے تو عجب آواز سی آتی اور سارے میں ایک ارتعاش پھیل جاتا۔ وہ ہولے ہولے چلتی درخت کے نیچے گئی۔ اسی وقت کچھ کچے آم نیچے گرے، اور کوئی ماورائی قسم کی ہنسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے وہ اٹھائے، منہ میں ڈالے، اور تشکر آمیز نظروں سے اوپر دیکھا۔ اس پر پھر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا، اور عجیب بات ہے اسی لمحے اس کے بائیں تلوے میں ایک کانٹا چبھا۔ نیند کا غلبہ جاتا رہا۔ وہ سی کر کے دہری ہوگئی۔ بیٹھ کے کانٹا نکالا، اور چلنے لگی۔ تھوڑی دیر ہی چلی تھی کہ پانی کی کھال نظر آئی۔ وہ اس کی طرف یوں بڑھی، جیسے کوئی بچھڑا بچہ ماں کی طرف بڑھتا ہے۔ خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ سارے جسم اور سر سے مٹی صاف کی۔ جی بھر کے پانی پیا۔ اس سے آگے پانی نیم سرخ اور گہرا مٹیالا ہو گیا تھا۔

دھوپ میں چند قدم چلی تو اسے لگا جیسے اس کے جسم کی ٹکور ہو رہی ہے۔ اس نے جسم میں تازگی اور کچھ توانائی محسوس کی۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے خود سے جیسے سوال کیا۔ یہ پہلا خیال تھا جو قدرے وضاحت کے ساتھ اسے کل رات کے بعد سے، اس کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اس نے اردگرد

دیکھا۔ دائیں جانب چارے کے کھیت تھے، بائیں طرف زمین خالی پڑی تھی ۔ جہاں چارے کے کھیت ختم ہوتے تھے، وہیں کماد کی فصل نظر آرہی تھی جو اس کے قد سے ذرا چھوٹی لگ رہی تھی۔ ٹیوب ویل کا صاف پانی کھال میں نظر آرہا ہے، مگر نہ بندہ نہ بندے کی ذات ۔اس نے پھر خود سے سوال کیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے دل میں ڈر محسوس کیا۔اس نے ایک نظر اپنے سراپے پر ڈالی ۔اس کا گلابی رنگ کا ریشمی قمیص اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔شلوار بھی اس کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی تھی، جس میں اس کی سڈول رانیں نمایاں ہورہی تھیں۔شلوار کے گیلے پائینچوں پر مٹی جم گئی تھی ۔اس نے باری باری دونوں پاؤں اٹھائے ، انھیں جھٹکا۔ کچھ مٹی اتری، لیکن ساتھ ہی اسے سر میں درد کی شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ مجھے کچھ کھانے کو کیا مل سکتا ہے؟ اس نے خود سے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ وہاں موجود کھیتوں پر نگاہ ڈالی، ادھر ادھر دیکھا، کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے ، وہاں پہنچی۔

وہیں خربوزے کا کھیت نظر پڑا۔اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔کھیت کے عین بیچ گھاس پھوس اور لکڑیوں سے کھڑی کی گئی عارضی کوٹھڑی تھی۔اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔کوئی دکھائی نہیں دیا تو اس نے ایک خربوزہ توڑا۔ کھال کے پانی سے دھویا۔ درخت کے تنے پر اسے مارا۔ وہ چر گیا۔ خاصا گرم تھا اور میٹھا بھی نہیں تھا مگر اس نے ندیدے پن سے پورا کھالیا۔اس نے جسم میں قدرے توانائی محسوس کی ،اور اعصاب میں ذراسی آسودگی۔ایک بار پھر اس نے اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس کیں۔اس مرتبہ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ پاس ہی شیشم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں تنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

وہ دوڑ کر اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے، جب اس کی دادی نے کہا تھا، اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ سینے پر دوپٹا لیا کرو، اور چھلانگیں نہ لگایا کرو۔لڑکوں کے ساتھ کھیلنا بھی بند کرو۔ وہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک مطلب نہیں سمجھی تھی مگر ایک نیا احساس اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا بدن گھر کے اس کمرے کی طرح ہے، جس میں اجنبی داخل نہیں ہوسکتے۔اس نے ایک دن تنہائی میں اسی کمرے میں کپڑے بدلتے ہوئے، اپنے ننگے جسم کو غور سے دیکھا تھا۔کوئی خاص تبدیلی نہیں، سوائے سینے پر دو گٹھلیاں سی نمودار ہوئی ہیں، جن میں اس

Scanned with CamScanner

نے ہلکا مگر میٹھا سا درد محسوس کیا تھا، اور ناف کے نیچے بھورے سے بال تھے۔ اس نے دونوں جگہوں پر ہاتھ پھیرا تو ایک برقی رو اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ وہ شرم سے دہری ہوگئی تھی، مگر چہرے پر عجیب شریری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بدن کو ایک خزانہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، جو ہر وقت خطرے میں تھا، لیکن وہ اس خطرے کے پہلو بہ پہلو ایک جادوئی سا غرور بھی محسوس کرنے لگی تھی..... کمرے میں کون ہو سکتا ہے؟ اجنبیت، خطرہ.... ایک سایہ سا ہے..... یہ کیا..... سانپ سا اس کی زخمی ران پر چل رہا ہے.... اور آگے بڑھ رہا ہے..... کمرے میں سانپ کیسے؟ دادو.... بابا.... وہ دوڑنے لگتی ہے، مگر پاؤں ہیں کہ اٹھتے ہی نہیں۔ وہ پسینہ محسوس کرتی ہے.... سانپ ناف کے قریب پہنچ رہا ہے... بالوں کو چھو رہا ہے..... وہ شدید ڈر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے واقعی ایک اجنبی تھا، جو پیلے کریہہ دانت نکالے ہنس رہا تھا.... اس نے چیخ ماری، مگر اس نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔

کیوں چیختی ہو؟ تمھیں کھانے کو میٹھے خربوزے دوں گا۔ یہ دیکھو۔ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔ بس تھوڑی دیر ہی کی تو بات ہے۔ وہ نرمی سے اسے کہہ رہا تھا، مگر وہ چلائے جا رہی تھی، اور اس کی آہنی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ جان بچانے کی جدوجہد اس کے لیے نئی نہیں تھی، مگر اس لمحے وہ اس سے کہیں بڑی جدوجہد میں جھونک دی گئی تھی۔ اس نے جوں ہی دیکھا، اس کی شلوار اتری ہوئی ہے، اس پر وحشت طاری ہوگئی۔ اسے لگا وہ زندگی کی بدترین بے شرمی کی حالت میں ہے۔ اس کا جی چاہا، وہ کسی گڑھے میں گر جائے، اور خود کو مٹی سے ڈھانپ لے۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں ساتھ ملائے، شدت سے بھینچے، اور اتنے زور سے چیخ ماری کہ درخت پر بیٹھی چڑیاں شور مچاتی اڑیں، اور کچھ کوے کائیں کائیں کرنے لگے۔ وہ اس کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے منھ پر ہاتھ رکھا، اور دوسرے ہاتھ سے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کے سینے کو چھیڑنے لگا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا، بے بسی کے کراہت انگیز احساس کی شدت سے، وہ مجنونانہ وحشت کے عالم میں، نفرت کے بدترین جذبے کے ساتھ ٹانگیں پٹخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابلتی نظر آئیں تو اس نے اسے چھوڑ دیا۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم کون ہو، یہاں کیا کر رہی ہو“۔ اس نے اس کے گال چھوتے ہوئے کہا، اور اس کے پاس ہی لیٹ گیا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا، اور ایک لمحے کے وقفے سے جھٹکے

سے اٹھی۔ سامنے کسی پڑی تھی، جس کے ذریعے کسان کھیتوں کی مینڈھیں سیدھی کرتے ہیں اور فصلوں کے پانی کا رخ تبدیل کرتے ہیں۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے کسی کے دستے کو پکڑ کر اٹھایا، اور پوری طاقت سے اس کا پھل اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے منہ سے جانور کے ڈکرانے جیسی آواز نکلی اور خون کی ایک تیز دھار پھوٹی، جو آناً فاناً اس کی آنکھوں اور چہرے پر پھیل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے کے زخم پر ہاتھ رکھا، اور ایک موٹی گالی دی۔ اٹھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس نے شلوار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا، اسے اوپر کھینچا، ستر ڈھانپا اور دوڑ پڑی۔

وہ دوڑ رہی تھی، پیچھے دیکھے بغیر، ادھر ادھر دیکھے بنا۔ اس وقت وہ ایک دس سالہ بچی نہیں تھی، اس سے سوا تھی۔ ایک محیر العقول لمحہ، اس کی ذات میں جیسے مجسم ہو گیا تھا، اور اسے تبدیل کر گیا تھا۔ وہ وقت کے ایک بالکل نئے مدار میں تھی۔ وہ اپنی عمر طبیعی سے عبارت وقت سے باہر جا پڑی تھی، اور یہ سب بالکل قبل از وقت ہوا تھا، اسی لیے وہ دہشت کی انتہا کا تجربہ کر رہی تھی، جو ڈر سے کہیں مختلف اور کہیں بڑی کیفیت تھی۔ اس نے ابھی ابھی، اپنی چند سالہ زندگی کی سب سے بڑی، اور انتہائی کڑی، جاں لیوا جدوجہد کے دوران میں خود میں ایک نئی اور عظیم چیز دریافت کی تھی۔ وہ جدوجہد اس کا انتخاب نہیں تھی، اس پر مسلط کی گئی تھی، اور اتنی عجلت میں، اور ایک ایسے بھیانک انداز میں مسلط کی گئی تھی کہ اسے ان طاقتوں سے یہ شکایت کا موقع بھی نہیں ملا تھا جو اس نوع کے فیصلے کرتی ہیں، فرشتوں کی کہانیاں سناتی ہیں، مگر فرشتے نہیں بھیجتی ہیں۔ اسے ابھی ابھی ایک خونی جنگ کے دوران میں، جس کے انجام کا تصور کرنے کی بھی اس میں تاب تھی نہ تصور کی طاقت تھی، اس پر کھلا تھا کہ انسانی وجود میں اپنی حفاظت کی اندھی خواہش سے بھی بڑی، ایک طلب ہوتی ہے۔ اس نے گو مبہم مگر غلبہ آفریں انداز میں دریافت کیا تھا کہ اس کی ہستی میں ایک ننھی سی، مقدس روشنی ہے، جس کی طرف اس نوجوان کسان نے انتہائی بے ڈھنگے پن اور نفرت انگیز وحشیانہ طریقے سے ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ پوری طرح اس روشنی کی کرن کو دیکھ بھی نہیں سکی تھی، سمجھنا تو دور کی بات، بس اس کے اسرار کو اس نے محسوس کیا، اور کسی انوکھی قوت کے زیر اثر، جو اسی روشنی کی ہی اصل میں دی ہوئی تھی، اس نے اپنی بساط سے بڑھ کر جنگ کرنے کا فیصلہ، بس پل بھر میں کیا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے، اپنا ازار بند باندھتے، زخموں اور غصے سے کراہتے،

خودکو اب تک اس جنگ کی حالت میں محسوس کر رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اسے کسان کا چہرہ یاد آیا، جسے ابلتی آنکھوں کے ساتھ اس نے دیکھا تھا۔ وہ اس کے بابا کی عمر کا تھا، اسے یاد آیا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ٹھیک اسی لمحے، وہ واپس مڑی۔

وہ ابھی تک کراہ رہا تھا۔ اس نے وہی کسی اٹھائی۔ اس نے خود میں زبردست تشددانہ طاقت محسوس کی، جس کا سرچشمہ، اس کا ناتواں زخمی جسم ہرگز نہیں تھا۔ اس نے کسی کے پے در پے وار اس کے سر پر، چہرے پر، بازوؤں پر، سینے پر اور ناف کے نیچے کیے۔ وہ چلاتا رہا، اول فول بکتا رہا، پھر خاموش اور سرد ہو گیا۔ وہ کسی کا دستہ پکڑ کر بیٹھ گئی، اور بری طرح رونے لگی۔ اسے شنی، دادی، دادا، اور اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ اس نے اس لہولہان لاشے کو دیکھا، اور اسے بابا بے تحاشہ یاد آیا، مگر وہ پرسکون تھی۔ درختوں پر کوے شور مچا رہے تھے۔ کچھ گلہریاں درخت کے تنے پر آ کر رکتیں، دم اوپر کیے تیزی سے ادھر دیکھتیں، اور شور مچاتی پھر درخت پر چڑھ جاتیں۔ البتہ چڑیاں خاموش تھیں۔

وہ اٹھی، اور کسی سے زمین کھودنے لگی۔ اسے کسی سے زمین کھودنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اس لیے بار بار کسی اس کے پاؤں سے ٹکراتی تھی، اور زخمی کر جاتی تھی، مگر اس نے کسی طرح چند فٹ زمین کھود ڈالی۔ لاش کو کھینچنا شروع کیا، جو خاصی وزنی تھی۔ وہ جس وقت لاش کو گڑھے کی طرف کھینچ رہی تھی، اس کے بال چہرے کو ڈھانپ رہے تھے، اور اس کی آنکھوں میں پڑ رہے تھے۔ بالوں پر خون تھا، کپڑوں پر خون تھا، چہرے، گردن، سر پر خون تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، بار بار گر پڑتی تھی۔ وہ کسی اور سیارے کی اجنبی مخلوق لگ رہی تھی، جسے اپنی بساط اور قابلیت سے بڑھ کر کام کرنا پڑ رہا تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد وہ لاش کو گڑھے میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس پر مٹی ڈالی۔ لاش کے پاؤں گڑھے سے باہر تھے۔ وہ اب ایک دس سالہ بچی تھی، جس کے بدن کا ایک ایک خلیہ تھکاوٹ سے چور تھا! اس نے دیکھا، اچانک سورج کی روشنی لپیٹی جا رہی ہے، درخت، فصلیں، گلہریاں سیاہی میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ پرندوں کی آوازیں کان میں بجنے والی سیٹیوں میں ڈوب رہی ہیں، اور سب کچھ ایک تاریک، مہیب، سنگین، ابدی خاموشی کی جھیل میں غائب ہونے لگا ہے!!

■•◆•◆•◆•■

Scanned with CamScanner

کنویں سے کٹورے تک

سب نے ایک ساتھ محسوس کیا کہ وہ مٹی سے نہیں، ریت سے بنائے گئے تھے!

ایک بات کو سب ایک ساتھ، ایک ہی طرح کیسے محسوس کر سکتے ہیں، اس پر سوچنے کا انھیں خیال نہیں آیا۔ آج سے پہلے ان کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ انھی میں سے کوئی، ان سے مختلف بھی سوچ سکتا ہے۔ ان پر پہلی مصیبت اس ہیبت و حیرت کی ملی جلی، قطعی انوکھی صورت میں نازل ہوئی کہ ایک واقعہ کیسے اتنا بڑا ہو سکتا ہے کہ ان کے عناصر کی ترکیب ہی کو بدل کے رکھ دے، اور وہ بھی بس ایک پل میں۔ وہ بڑے واقعات کا تصور کرنے کے اہل تھے۔ انھوں نے عظیم طوفانوں، بستیوں کو پل بھر میں ملیا میٹ کر دینے والے زلزلوں، صحراؤں میں اچانک پھوٹ پڑنے والے چشموں، چلتے قافلوں کے اچانک زمین میں گڑ جانے اور صفحہء خاک ہی سے نہیں، صفحہء کتاب سے بھی، ان کے ذکر کے غائب ہو جانے جیسے بڑے واقعات سن، پڑھ رکھے تھے۔ ان کے ذہنوں میں بڑے واقعے کا تصور سادہ سا تھا۔ اچانک چھا جانے والی عظیم بربادی ایک بڑا واقعہ تھا یا جسے وہ سمجھنے میں خود کو عاجز سمجھیں اور تعظیم سے اپنے سروں کو جھکا ہوا پائیں، وہ ایک بڑا واقعہ تھا۔ لیکن اس طرح کے بڑے واقعے کا انھیں کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ جسے وہ سمجھنے سے تو عاجز ہوں، مگر تعظیم کے بجائے ہیبت محسوس کریں، اور گڑبڑا جائیں کہ ہیبت بڑی ہے یا حیرت، اور اسی دوران میں ان کے عناصر کی ترکیب بدل جائے۔ وہ مٹی سے بنائے گئے تھے، یہ اسی کتاب میں لکھا تھا۔ کتاب کا لکھا غلط کیسے ہو سکتا ہے! وہ مٹی سے بنے تھے تو ایک ہی پل میں سب ریت کی مانند کیوں ہو گئے۔ ان کے ذروں کو جس قوت نے جوڑ رکھا تھا، کیا

Scanned with CamScanner

وہ کتاب ہی کے ساتھ رخصت ہوگئی؟ یہ سوچتے ہی انھیں لگا کہ جیسے ریت سرکنے لگی ہے۔سب پر دہشت طاری ہوئی۔

انھوں نے پہلی مرتبہ دہشت کو اس شدت سے محسوس کیا کہ انھیں لگا، دہشت دنیا کا سب سے بڑا شر ہے۔ کتاب ہی میں مذکور تھا کہ ایک شر سب سے بڑا ہے۔ اتنا بڑا ہے کہ وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتا؛ اتنا گھناؤنا ہے کہ اسے ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ اس کے قریب نہیں پھٹکتا؛ اتنا خوف ناک ہے کہ آدم کے تخیل کے پر، اس کے خیال ہی سے جلنے لگتے ہیں۔ کتاب میں اس کا ذکر پڑھتے ہوئے وہ ڈر جایا کرتے تھے۔ وہ لفظوں سے باہر ایک عظیم الشان دنیا کا تصور تو رکھتے تھے، مگر اپنے اور اس دنیا کے درمیان کتاب کے لفظوں کو وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ اس دنیا کا خیال کرنے سے خود کو قاصر سمجھتے تھے کہ جس کا وسیلہ ان کی کتاب کے لفظ نہ بن سکیں۔ انھیں یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ جو شر لفظوں میں نہیں سماتا، وہ کہاں وجود رکھتا ہے۔ انھیں کتاب ہی نے یہ یقین دلا رکھا تھا کہ لفظ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ جو کہیں نہیں سماتا، وہ لفظ میں سما جاتا ہے۔ وہ اپنے اس یقین کو بار بار دہرانے کے عادی تھے کہ کتاب میں لکھا غلط نہیں ہوسکتا، اور سب کچھ ان کی کتاب ہی کے لفظوں میں سمایا ہوا ہے۔ البتہ انھیں سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے۔ اس بات کا بھی انھیں کئی مرتبہ احساس ہوا تھا۔

انھیں یہ بھی احساس تھا کہ کتاب ہی کی وجہ سے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک بات کو ایک وقت میں صحیح سمجھتے تھے، لیکن کتاب میں جب کوئی دوسری بات پڑھتے تو پہلی بات انھیں غلط محسوس ہونے لگتی۔ وہ تڑپ تڑپ جاتے، مگر جلد ہی انھیں اپنی سمجھ کے ناقص ہونے کا خیال آتا تو وہ سنبھل جاتے۔ خود سے کہتے یا تو ہم پہلے غلط تھے، یا اب غلط ہیں۔ کچھ تو اپنی سمجھ کو دو چار صلواتیں بھی سنا دیا کرتے۔ لیکن جب انھیں لگتا کہ ان کی سمجھ اس کٹورے کی طرح ہے، جس میں بس تھوڑا سا پانی وہ بھر سکتے ہیں، اتنا تھوڑا کہ کبھی اس سے آدمی کی پیاس بھی نہیں بجھتی، تو ان کو اطمینان محسوس ہوتا۔ کبھی کبھی انھیں یہ خیال ضرور آتا کہ کٹورا اگر چھوٹا ہے تو پیاس کیوں زیادہ ہے۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتے کہ اگر پیاس اتنی ہی ہوتی اور کٹورا سرے سے ہوتا ہی نہ تو وہ کیا کرتے۔ لیکن اس تسلی کی تہ میں بھی ایک بے کلی سی انھیں، یہ سوچتے ہی جلد ہی محسوس ہوتی کہ انھیں روز یہ کٹورا بھرنا پڑتا ہے۔ اور یہ مشقت ہے۔

یہ بات سب کو اچھی طرح یاد تھی کہ انھوں نے کتاب ہی میں پڑھا کہ جو پیدا ہوا، اسے مرا سمجھو۔ سب نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ آدمی پیدا ہونے کے بعد صرف موت کی طرف بڑھتا ہے۔ آدمی کے تجربے اور دسترس میں جو کچھ آتا ہے، وہ اپنے مٹنے کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن ان کا خیال کتاب کی طرف گیا۔ وہ کانپ کر رہ گئے۔ کتاب بھی ایک دن ختم ہو جائے گی؟

یہ دوسرا موقع تھا کہ ان کے درمیان بحث ہوئی۔ ان کے درمیان پہلی مرتبہ بحث اس وقت ہوئی تھی، جب یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ کتاب کی حفاظت کیسے کی جائے؟ یہ سوال اس شخص نے اٹھایا تھا جسے سوچنے اور پھر فکر مند رہنے کی عادت تھی۔ اس کے جواب میں تین بزرگوں نے کہا کہ جو ہماری حفاظت کرتی ہے، اس کی حفاظت ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ سوال اٹھانے والے شخص نے کہا تو کیا ہم اسے کہیں ہواؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں؟ دونو جوان آگے بڑھے اور کہنے لگے: تم دیکھنا ہوائیں بھی کتاب کی حفاظت میں آجائیں گی، اور ان کی آوارہ مزاجی کو قرار آجائے گا۔ سوچنے والے شخص نے پوچھا، اور اگر ہواؤں کی آوارہ مزاجی کی زد پر کتاب کے اوراق آگئے تو؟ یہ سن کر سب سہم گئے۔ شک کا ایک کانٹا سا ان کے دل میں پیدا ہوا۔ انھیں یاد آیا۔ کتاب ہی میں لکھا تھا۔ شک، خوف کی اولاد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا یقین مزید پختہ ہوا کہ جو کتاب ہر لمحے ان کی استعانت کو پہنچتی ہے، اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

کتاب پیدا تھوڑی ہوئی ہے کہ ختم ہو جائے گی؟

کتاب بھی ایک دن ختم ہو جائے گی؟ انھوں نے ڈرتے ڈرتے بحث شروع کی۔ اس مرتبہ بحث کا محرک ایک شاعر تھا۔ اس نے سب سے پوچھا، کیا کتاب لکھی نہیں گئی؟

ہاں، کتاب لکھی گئی ہے۔

لیکن ایک وقت میں لکھی جانی شروع ہوئی، پھر ایک وقت میں مکمل یعنی ختم ہوئی۔

ایسا مت کہو۔ کتاب اس وقت سے باہر ہے، جس وقت میں ہم زندہ ہیں۔

اگر کتاب ہمارے وقت سے باہر ہے تو ہم سے کلام کیسے کرتی ہے؟

کتاب اگر ہمارے ہی وقت میں ہوتی تو ہم اس کا کلام سنتے ہی کیوں؟ ہم اپنے وقت میں

Scanned with CamScanner

اسی وقت جی سکتے ہیں، جب ہمیں کوئی دوسرے وقت والا سمجھائے کہ کیسے جینا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بھی اسی وقت سنتے ہیں، جب وہ کچھ دیر کے لیے ہمارے وقت سے باہر نکل کر، کسی دوسرے وقت، اور دوسری دنیا کی خبر لاتا ہے۔ یہ بھی مت کہو کہ کتاب ایک وقت میں لکھی جانے شروع ہوئی، اور مکمل ہوئی۔ نہ یہ شروع ہوئی، نہ مکمل ہوئی۔ یہ ہے۔ بس۔

لیکن یہ ایک مقام سے شروع ہوتی ہے، اور ایک جگہ پہنچ کر مکمل ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ آغاز اور انجام میں گھری ہے۔

نہیں، کتاب نہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ تم اسے کہیں سے پڑھو، تمھیں وہ سب دیتی ہے، جس کی آرزو میں تم اسے پڑھتے ہو۔

ہاں، کتاب نہ پیدا ہوئی، نہ مرے گی، نہ اس کی ابتدا ہے، نہ خاتمہ۔ یہ ہے۔ بس۔

سب نے اتفاق کیا۔ سب نے تسلیم کیا کہ وہ سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں، کتاب نہیں۔

انھوں نے دہشت کا، یعنی دنیا کے سب سے بڑے شر کا سامنا کیا تو انھیں یقین ہوا کہ کتاب میں اس کے بارے میں لکھا ہوا سچ تھا۔ جب تک کتاب تھی، کتاب میں لکھے ہوئے لفظ تھے، شر نہیں تھا۔ آج انھیں لگا کہ دہشت ہی سب سے بڑا شر ہے۔

ایک پہر گزر گیا۔ دوپہر ہوئی۔ بیساکھ کا سورج عین سروں کے اوپر تھا۔

بستی کے عین بیچ چوراہے پر سب جمع تھے۔ سب کے چہرے پیلے پڑ چکے تھے۔ دہشت نے ان کے عناصر کی ترکیب بدل دی تھی۔ ان کے آدھے سے زیادہ دھڑ ریت بن کر وہیں ڈھیر ہو گئے تھے۔ چوراہے میں ریت کا ٹیلا بنتا جا رہا تھا، جس پر انسانی کھوپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ آنکھیں دہشت سے باہر کو نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھیں دہشت بن گئی تھیں۔ ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا تو محسوس کیا۔ سب ایک دوسرے سے ڈر گئے۔ سب ایک دوسرے سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کوشش میں ریت کا ٹیلہ مزید بڑا ہونے لگا۔ ہمارے اندر اتنی ریت آئی کہاں سے؟ وہ یہ سوچ کر مزید دہشت زدہ ہوئے۔

Scanned with CamScanner

دوسرے پہر میں ایک تبدیلی محسوس ہونا شروع ہوئی۔ ایک شخص نے اچانک رونا شروع کیا۔ باقی سب کی دہشت مزید بڑھ گئی۔ وہ پہلا شخص تھا، جس نے پہلی بار بستی کے دوسرے لوگوں سے الگ طرح محسوس کیا۔ کچھ دیر اس نے گریہ کیا، پھر آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ خود کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ سب دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے نچلے دھڑ کی ریت غائب ہوگئی تھی۔ باقی سب نے اپنے نچلے دھڑوں کو دیکھا۔ ان کی دہشت مزید بڑھ گئی، اور انھوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ریت ان کے سینے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

وہ شخص ریت سے اپنے پاؤں بچاتا ہوا باہر آیا۔ وہ کیا کرے؟ یہ پہلا خیال تھا، جو اسے ان دو پہروں میں آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس خیال میں بستی کے لوگ شریک نہیں ہیں۔ وہ باقیوں سے الگ ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ، اس کے عناصر کی ترکیب اور طرح سے بدلی ہے۔ یہ خیال آج تک اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے اس نے جو کچھ سوچا تھا، اس کی تحریک اسے کتاب سے ہوا کرتی تھی۔ آج سے پہلے وہ واقف ہی نہیں تھا کہ کوئی بات کتاب سے ہٹ کر بھی اس کے ذہن میں آسکتی ہے۔ اس کی سمجھ کے کٹورے میں کہیں اور سے بھی پانی آسکتا ہے۔ اس نے ریت کے بڑھتے ہوئے ٹیلے کو دیکھا، اور رک گیا۔ یہ بھی پہلی بار تھا کہ وہ سوچے چلا جا رہا تھا، اور کوئی عمل نہیں کر رہا تھا۔ دہشت سے باہر کو نکلی سیکڑوں آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

اس نے دیکھا کہ ایک اور شخص بھی ریت سے پاؤں بچاتا ہوا باہر آرہا ہے۔

وہ اس کے پاس آکر رک گیا۔ وہ کیا کرے؟ یہ خیال اسے بھی آیا۔ اس نے بھی محسوس کیا کہ ریت میں دھنسے اس کے خیال میں شریک نہیں ہیں۔ وہ بھی رک گیا۔

دونوں نے دیکھا کہ ایک اور شخص بھی احتیاط سے قدم اٹھاتا ان کی طرف آرہا ہے۔ اس نے بھی سوچا کہ کیا کرے؟ اسے بھی باقیوں سے الگ ہونے کا خیال آیا۔

پہلا شخص، کچھ سوچتے ہوئے بستی کے چوراہے کے شمالی کونے کے چبوترے پر پہنچا۔ باقی دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ دہشت سے ابلتی آنکھیں ان تینوں پر مرکوز تھیں۔

ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ سب سے آخر میں آنے والے باریش بوڑھے شخص نے کہا۔

ہمیں نہیں، ہم میں سے ہر ایک کو کیا کرنا لازم ہے؟ پہلے کے بعد آنے والے سفید چہرے والے جوان شخص نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

کیا لازم ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ دوسرے کیسے کر سکتے ہیں؟ پہلے آنے والے شخص نے کہا، جس کی بستی میں شہرت ایک لاپروا شخص کی تھی۔

دہشت سے باہر کو ابلتی نظریں ان پر مرکوز تھیں۔

ہمیں سب سے پہلے ان کو بچانا چاہیے جو ریت میں دھنستے جا رہے ہیں۔ پہلے نے کہا۔

لیکن پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ اس پل کیا یہی سب سے اہم فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے؟ دوسرے نے سوال داغا۔

میں پھر کہوں گا، دوسروں کا فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟ میں ان کے بارے میں فیصلہ کر کے ،ان کے اختیار کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ پہلے شخص نے کہا۔

تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ تم اپنا فیصلہ کر سکتے ہو؟ دوسرے شخص نے پہلے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

جیسے میں تم سے پہلے وہاں سے اٹھ کر آیا۔ تم نے میرے فیصلے کی تقلید کی۔ پہلا تڑاق سے بولا۔

دنیا میں دو ہی طرح کے عمل ہیں، اچھے یا برے۔ تقلید کے قابل یا ردّ کیے جانے کے قابل۔ ہماری زندگی میں اس کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور یہ بھی یاد رکھو، کسی کا کوئی عمل ،اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ کسی کا فیصلہ صرف اس شخص تک محدود نہیں ہوتا۔ ذرا پیچھے جا کر دیکھو، تمھاری پیدائش کس کا فیصلہ تھی؟ تم دوسروں کے فیصلوں کی پیداوار ہو۔

میری پیدائش میرے والدین کا ذاتی فیصلہ تھی۔ پہلے نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

یہ بھی تمھاری غلط فہمی ہے۔ تمھارے والدین کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ تم ایک ایسے عمل کے نتیجے میں دنیا میں تشریف لاؤ گے، جسے انھوں نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے انجام دیا تھا۔ انھوں نے دوسروں کی تقلید کی تھی، بھوک مٹانے کے عمل کو اچھا سمجھا تھا۔ انھوں نے یہ عمل ایجاد نہیں کیا

تھا۔ دوسرے شخص نے پہلے کو جیسے خاموش کرانا چاہا۔

دنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں، جو اچھے یا برے نہیں، وہ دل چسپ یا بے زار کن ہیں۔ جیسے تم سے بات کرتے ہوئے میں بے زاری محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے نے جیسے حملے سے سنبھلنے کی کوشش کی۔

جو چیز اچھی ہوتی ہے، وہ دل چسپ بھی ہو سکتی ہے، اور جو چیز بری ہے، وہ لازماً بے زار کر دینے والی بھی ہوتی ہے۔ پہلے نے بغیر تامل کے کہا۔

تم دنیا کو اچھی اور بری میں تقسیم کر کے، اس دنیا کے حسن کو غارت کرنا چاہتے ہو۔ دنیا میں کچھ ابدی نہیں۔ پہلے نے کہا۔

اس بات پر پہلا شخص چونکا، جو سر نیہوڑائے کسی خیال میں غرق محسوس ہوتا تھا۔ بولا: ایک فانی شخص کیسے تکبر سے کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں کچھ ابدی نہیں۔ تم نے دنیا کو محض اپنی ریت میں دھنسی ٹانگوں تک محدود سمجھا ہے، کیا؟

میں فانی ہوں، میں مٹی ہوں، میں ریت بن جاتا ہوں، پھر مٹی بن جاتا ہوں۔ میں وہی کہوں گا، جس سے مجھے رنج یا خوشی ملتی ہے۔ میری دنیا وہی ہے جسے میں محسوس کرتا ہوں۔ تم اس دنیا کو دنیا کہتے ہو، جو صرف تمھارے خیال میں آ سکتی ہے۔ خیال سے زیادہ دھوکا دینے والی کوئی شے نہیں۔ پہلا شخص بولا۔

ٹھیک کہا، تم جس طرح کے خیالات بتا رہے ہو، وہ دھوکا دینے والے ہیں۔ پہلا شخص بولا۔ ہم دھوکے میں رہتے ہیں، جب تک ہم سمجھ نہیں جاتے کہ ہم دھوکے میں تھے۔

میں پھر کہوں گا کہ ہمیں سوچنے سے پہلے فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں کیا سوچنا چاہیے، اور کیا نہیں؟ دوسرے نے کہا۔

وہ تینوں بھول چکے تھے کہ سیکڑوں دہشت زدہ نظریں ان پر مرکوز ہیں۔ ایک پہر بعد ان تینوں کو اچانک لگا کہ وہ آپس میں بحث کیے جا رہے ہیں۔ ان تینوں نے پہلی مرتبہ ایک نئی چیز دریافت

Scanned with CamScanner

کی تھی۔ اپنے اپنے خیال کے اظہار کی لذت۔ ان کی حالت اس بچے کی سی تھی جس نے ابھی ابھی چلنا شروع کیا ہو، اور جس سے نچلا نہ بیٹھا جاتا ہو۔

اسی دوران میں دوسرا شخص بولا۔ ہم نے ان کو بھول کر ظلم کیا۔ دوسرے نے کہا: ہم ظلم کرنے کے قابل ہی کہاں ہیں؟ ہم نے خود کو بچایا، کیا یہ ان پر ظلم ہے جو خود کو نہیں بچا سکے۔

یہ خود غرضانہ سوچ ہے۔ خود کو بچانے کے بعد، مصیبت میں گھروں کو بھول جانا ظلم ہے۔ تیسرے نے کہا۔

ہم انھی میں سے تھے۔ ہم نے خود کو بچا لیا۔ وہ کیوں نہیں بچا سکے؟ یہ خیال تینوں کو آیا، اور تینوں نے ایک دوسرے کو بتایا۔

ہوسکتا ہے کہ ہم اب تک اس وہم میں گرفتار رہے ہوں کہ ہم انھی میں سے ہیں۔ کیا تم کو وہ قصہ بھول گیا، جو کتاب میں لکھا تھا؟ تین آدمی ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں نے انھیں پہچانتے ہوئے کہا: تم کہاں چلے گئے تھے؟ ایک کو مخاطب کر کے کہا: تمھارا بیٹا کڑیل جوان بن گیا ہے۔ دوسرے سے کہا: تیری بوڑھی ماں تیری واپسی کا رستہ دیکھتے دیکھتے دنیا سے گزر گئی۔ تیسرے سے کہا۔ تیرا بھائی تیری تلاش میں نکلا، اب تک واپس نہ آیا۔ تینوں حیران ہوئے۔ ہم تو اپنی بستی کے گم شدہ لوگوں کو یہاں تلاش کرنے آئے ہیں۔ نہیں تم خود گم ہوئے تھے؟ بستی والوں نے تینوں کو ان کی نشانیوں سے پہچانتے ہوئے کہا۔ دیکھو، تم تینوں کے ماتھوں، ہاتھوں اور کلائیوں پر زخموں کے نشان اُس لڑائی میں لگے تھے، جو ہم سب نے مل کر اس عفریت سے لڑی تھی، جو ہر سال ہمارا اناج ہتھیانے آیا کرتا تھا۔ پر ہمیں کچھ یاد نہیں۔ تم اور باقی لوگ بھی بے ہوش گئے تھے، اس لیے تمھیں بھول گیا ہوگا۔ وہ تینوں اُس وہم میں پڑ گئے کہ وہ کھوئے گئے تھے، یا کھوؤں ہوؤں کی تلاش میں نکلے تھے۔

پر ہمیں یقین ہونے لگا ہے کہ ہم ان میں سے نہیں تھے۔

اگر ان میں سے نہیں تھے تو کہاں کے تھے؟

جہاں، اب، اس وقت ہیں۔

پر اس وقت بھی تو انھی کے سامنے بیٹھے ہیں۔

Scanned with CamScanner

جس نے ایک طویل عمر وہم میں گزاری ہو، کیا اس کا یقین، قابل اعتبار ہوسکتا ہے؟ ہم اس بات کو سمجھے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ سفید چہرے والے جوان شخص نے کہا۔

اندھیرے سے روشنی میں جائیں تو کچھ دیر کے لیے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ جس وقت آنکھیں چندھیائی ہوں، اس وقت سوال نہیں کرنا چاہیے، صرف اس وقت کے گزرنے کا انتظار کرنا چاہیے، ورنہ اندھیرے اور روشنی کی سچائیوں کا فرق ہم ہمیشہ کے لیے بھول سکتے ہیں۔ وہم اور یقین کے بیچ بھی چندھیانے کا وقفہ آتا ہے۔

کیا ہم اسی وقفے میں ہیں؟ اب کے باریش بزرگ بولے، جن کی آواز میں خوف تھا۔

ہمیں بس اتنا معلوم ہے کہ ہم ایک پہر پہلے ریت سے بچ کر یہاں آئے ہیں۔ سفید چہرے والا نوجوان بولا۔

اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نے ان کو ریت سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ پہلا شخص بولا۔

لگتا ہے تم کتاب کا ایک اور قصہ بھی بھول گئے ہو۔ سفید چہرے والا نوجوان بولا۔ دو بھائی دریا کے کنارے پر پہنچے۔ دوسرے کنارے پر جانے کے لیے دریا میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک دوشیزہ نے فریاد کی۔ مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ پار پہنچا دو۔ احسان ہوگا۔ بڑے نے کاندھے پہ اسے بٹھایا۔ تینوں دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچے۔ بھائیوں نے اپنی راہ لی، دوشیزہ نے اپنی۔ چند قدم چلے تو چھوٹا بھائی بولا۔ ایک جوان لڑکی کا بدن تمھارے بدن سے مس ہوتا رہا۔ تمھارے جذبات میں ہلچل ہوئی ہوگی؟ بڑا بھائی بولا۔ میں نے تو اسے کنارے پر اتار دیا۔ تم نے اب تک اسے سوار کر رکھا ہے۔ ذہن کا بوجھ، کاندھے کے بوجھ سے بڑا ہوتا ہے۔

صحیح کہا۔ ہم دریا پار اتر گئے اور دوشیزہ کی چیخوں کو بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلا شخص بولا۔

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ وہ دریا پایاب تھا۔ لڑکی ڈر کی وجہ سے، دوسرے کا احسان لینے پر مجبور ہوئی۔ سفید چہرے والا نوجوان بولا۔

Scanned with CamScanner

اسی دوران ان تینوں نے دیکھا۔شام کے سائے دہشت زدہ آنکھوں میں اتر آئے تھے۔وہ آنکھیں بھیانک ہونے لگی تھیں۔وہ تینوں اپنی نئی دریافت کردہ لذت میں کھوئے تھے۔

☆

رات کی اوّلین ساعتیں آن پہنچیں۔روشنی مٹ گئی۔تاریکی رینگتی ہوئی،سب پر چھا گئی۔

اورتم دیکھو گے،یقیناً تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ کس طرح سفید لٹھے کی چادر،سیاہ رنگ کے ناگ میں بدل جائے گی۔تم پر ہیبت چھا جائے گی۔تم ڈر کے مارے جائے پناہ تلاش کرو گے۔ہر طرف سیاہ ناگ کی بادشاہی پاؤ گے۔پھرتم ایک دوسرے سے لپٹ جاؤ گے۔تم خود ناگ بن جاؤ گے۔تم اپنی بادشاہی کا اعلان کرنے لگو گے۔تم اپنا زہر دوسرے کے زہر میں انڈیلو گے،اور اندھے شرابیوں کی طرح ناچو گے۔اورتم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے لٹھے کی سفید چادر تمھارے روبرو ہے۔اورتم خوشی اور تشکر سے سر جھکا دو گے۔

لیکن یہ اور طرح کی رات کی ہے۔یہ سیاہی اور طرح کی ہے۔یہ دہشت زدہ روحوں کی آخری امید کو مٹا دینے والی سیاہی ہے۔یہ رات کہاں سے آئی ہے؟تم ان سورجوں کا شمار کر سکتے ہو،جو ڈوبتے کہیں ہیں،مگر ان کی ظلمت انسان کے دل پر دھاوا کرتی ہے۔انسان کے دل میں جتنی کشش ظلمت کے لیے ہے،اتنی کشش روشنی کے لیے کیوں نہیں؟تم نے دیکھا نہیں کہ جب دور دراز کے سیاروں سے ظلمت،آدمی کے دل تک نہ پہنچ سکے تو ظالم دل خود ظلمت پیدا کرنے لگتا ہے۔تمھاری سانس کی ڈور،ڈر سے بنائی گئی ہے۔کہو،ڈر سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ہاں،یہ اور طرح کی رات ہے۔ہم اس سورج کی قسم کھاتے ہیں،جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ کبھی نہیں ڈوبے گا،یہ اور طرح کی رات ہے۔

ان تینوں نے دیکھا کہ ریت کے ٹیلے میں کچھ ہلچل ہوئی ہے۔تھوڑی دیر بعد انھوں نے ایک چیخ سنی۔دہشت زدہ آنکھوں میں جیسے ریت گھسنے لگی۔اچانک ایک گرج دار آواز سنائی دی۔وہ تینوں بھی ڈر گئے۔جس ریت سے وہ بچنے میں کامیاب ہوئے تھے،وہ مسلسل بڑھ رہی تھی۔اگر یہی

ریت طوفان بن گئی تو؟ اس خیال سے ان کا ڈر اور بڑھ گیا۔ ابھی گرج دار آواز کا ڈر دور نہیں ہوا تھا کہ ایک واضح، قطعی، صاف آواز انھیں سنائی دی۔ انھوں نے آنکھیں پھاڑ کے ریت کے ٹیلے کی طرف دیکھا۔ ایک سرمئی ہیولا انھیں نظر آیا، جسے وہ پہچان نہیں سکے۔ یہ اسی دوشیزہ کی چیخ تھی، جواب ہم سے حساب مانگے گی۔ پہلے شخص نے اپنے ڈر کو چھپائے بغیر کہا۔ باقی دونوں چپ رہے۔ اسی دوران میں واضح آواز، واضح لفظ ادا کرنے لگی۔ وہ ہیولا سب سے مخاطب تھا۔

میں ان میں سے نہیں ہوں، جن کی کھوپڑی، ان کے سینے سے بڑی ہوگئی۔ میں ان میں سے نہیں ہوں، جنھوں نے اپنے بچاؤ کے لیے تمھاری ریت کو روندا، اور جن کے سینے میں خلش پیدا نہ ہوئی۔ میں ان میں سے نہیں ہوں، جو اتنا نہ سمجھ سکے کہ آدمی کی ریت، آدمی سے زیادہ حرمت اختیار کر جاتی ہے۔ ایک مرتا ہوا آدمی، دنیا کے سب جینے والوں سے زیادہ حرمت اختیار کر جاتا ہے، اور سب جینے والوں کی مشترکہ ذمہ داری بن جاتا ہے، اور جو اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرتے ہیں، ان کا شمار قاتلوں میں ہوتا ہے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں، جنھوں نے یہ حقیقت نہ سمجھی کہ ہمیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی ابتلا کا سامنا ہے۔ جنھیں اپنی ریت کو سمیٹتے ہی یہ ابتلا بھول گئی، اور وہ اپنی اپنی باتوں کی لذت کا شکار ہوئے۔ انھوں نے خود کو ہم سے الگ کرلیا۔ ہم سب ڈھ گئے۔ ہمارے عناصر بدل گئے۔ ہم مٹی سے ریت ہوئے۔ ہم نے دنیا کے سب سے بڑے شر کا سامنا کیا۔ ہم نے دہشت کو اپنی روحوں پر قابض پایا۔ ہم سب کو اس سچ کا سامنا کرنا ہوگا، جسے بدلنے کی طاقت ہم میں نہیں۔ جو گزر گیا، اس کو بدلنے کی طاقت ہم میں نہیں۔ جو گزر گیا، اس کے ساتھ وہ عظیم حقیقت ہم سے کھوگئی جس کے بغیر ہم نے صبح کی، نہ دوپہر، نہ رات۔ جس کے جاتے ہی ہمارا حافظہ کھو گیا۔ ہم ایک عظیم بھول کا شکار ہوئے۔ ہم اپنے بچوں، اپنی بیویوں، اپنے ماں باپ کو پہچاننے سے قاصر ہوئے۔ ہم اپنی گلیوں، گلیوں کی خاک، اپنی کھیتیوں، اپنی کھیتیوں کے درختوں، پرندوں، جانوروں کی شناخت سے عاری ہوئے۔ ہم نے پہلی مرتبہ جانا کہ گم شدگی کیا ہوتی ہے۔ آپ ایک جانے پہچانے راستے پر چل رہے ہوں کہ اچانک آپ کے ذہن سے اس راستے کا نقشہ مٹ جائے۔ ایک بھیانک خالی پن، ایک ناقابل برداشت ہولناکی کے ساتھ آپ پر یلغار کرے، اپنے مہیب جبڑوں میں کس لے۔

Scanned with CamScanner

یہ سچ ہے، وہ ہم سے کھو گئی۔ جس طرح یہ رات سچ ہے، جس طرح ہماری روحوں کو نوچتی ہوئی دہشت سچ ہے، جس طرح یہ ریت، یہ ہم سب کی آنکھوں میں رکی ہوئی ویرانی سچ ہے، جس طرح وہ تین الگ بیٹھے ہوئے لوگ سچ ہیں، جس طرح یہ سچ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی لذت کا شکار ہوئے، اسی طرح یہ سچ ہے کہ اب وہ ہمارے پاس نہیں۔

رات سے کچھ پہلے، جب پرندوں کی ڈاریں اڑتے اڑتے کسی پہاڑ سے ٹکرا جائیں۔ کسی کے پر ٹوٹیں، کسی کی گردن۔ وادی خون، ٹوٹے پروں اور چیخوں سے بھر جائے۔ کیا ان کی اولادیں اڑنا بھول جائیں گی؟

ہمیں اس کے سوا بھی بہت کچھ یاد کرنا ہوگا۔ جو ہمیں بھول گیا ہے، ہمیں وہ یاد کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک جنگ شروع کرنی ہوگی، اپنی بھول کے خلاف۔ ہم اس کے بغیر ریت ہوئے۔ اگر ہم نے اپنی بھول کے خلاف جنگ شروع نہ کی تو بے نشان ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنی ہی بھول قتل کر ڈالے گی، اور ہم دنیا میں پہلی بستی میں بسنے والے ہوں گے جن کا خاتمہ انھی کی بھول نے کیا ہوگا۔ ہم دنیا میں انسانوں کی پہلی پیڑھی ہوں گے، جو اپنی قاتل خود ہوگی، اور جو کسی سے خوں بہا نہیں مانگ سکے گی، کسی کے خلاف استغاثے کے لیے موجود ہی نہ ہوگی۔ انسانوں کی تاریخ میں ہم ایک انوکھے جرم کی مثال کے طور پر باقی رہیں گے، مگر خود نہیں۔ ہمارا باقی نہ رہنا آفاق کا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوگا، کیا پتا کتنی کائناتیں ڈوب چکیں... یہ بھی کتاب میں لکھا تھا۔ جو تم دیکھتے ہو، اس سے کہیں زیادہ، کہیں عظیم الشان دنیائیں تھیں اور ہیں، جو تمھارے تخیل میں بھی نہیں آسکتیں... لیکن اپنی نسل کو قائم نہ رکھنا، دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔ ہم نسل انسانی کی شاخ ہیں۔ نسل انسانی ایک پیڑ ہے۔ ایک شاخ کا کٹ جانا، ایک بازو کا کٹ جانا ہے۔

تم نے کبھی چیونٹیوں کو راستوں میں یا دیواروں پر چلتے دیکھا ہے؟ سمجھ والوں کے لیے قدم قدم پر نشانیاں ہیں۔ جب تم اپنی بے دھیانی میں کچھ چیونٹیوں کو کچل دیتے ہو تو ایک پل کے لیے رک کر غور کیا کہ باقی چیونٹیوں پر کیا گزرتی ہے؟ وہ کتنی دیر بھٹکتی ہیں۔ تمھیں کیا معلوم کہ تمھارے اور چیونٹی کے

وقت میں کیا فرق ہے؟ تمھیں یہ بھی خبر کہاں کہ چیونٹی اپنی ایک صدی میں جتنا کچھ حاصل کرتی ہے، وہ تم ایک پل میں حاصل کر لیتے ہو۔ تمھارے اور چیونٹی کے حاصل میں فرق ہی کتنا ہے! رات کی اس تنہائی میں، جب تم سے تمھاری روح کے علاوہ کوئی کلام نہیں کرتا، چھوٹی چھوٹی مثالوں پر سوچا کرو۔ جس سچ کی تاب تمھیں نہیں ہوتی، وہ چیونٹی کی معمولی مثال میں سما جاتا ہے۔

ایک انسانی گروہ کے مٹ جانے سے پوری نوع انسانی جانے کتنے زمانوں تک بھٹکتی رہتی ہے۔ ایک زنجیر ہے، جو ہم سب کے ملنے سے بنی ہے۔ ایک تتلی کا پر ٹوٹتا ہے تو اس کی صدا عالم کے دوسرے کونے پر غل مچاتی ہے۔ تم یہاں بیٹھے اپنے ریت ہونے پر قناعت کرتے ہو تو دوسری بستی ،دوسرے زمانوں کے لوگوں کی ٹانگیں سوکھ جاتی ہیں۔ ہم سے پہلے بہت قافلے بھٹکے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے اپنی بھول سے سمجھوتہ کر لیا۔ وہ آدمیوں سے حشرات بن گئے۔ ایسے حشرات جنھیں انسانوں نے اپنی بستیوں سے نکال دیا اور حشرات نے انھیں قبول نہ کیا۔ ان کی مٹی بھی ریت ہوئی، انھوں نے ریت کو یاد رکھا اور مٹی کو بھول گئے۔ ان کی بھول کی پیڑ ہم سب نے بھگتی ہے۔ ہم راستے بھولے ہیں۔ ہم راستے اور گڑھے کا فرق بھولے ہیں۔ جب مٹی ہمارے نتھنوں میں گھسی ہے ،اور ہمارے سینوں میں پیڑ ایک اچانک بھونچال کی طرح اٹھی ہے ،تو ہمیں لگا کہ ہم چل نہیں رہے تھے ، رینگ رہے تھے۔ ہم خوابوں میں ڈرے ہیں۔ ہمیں ان گم راہ قافلوں کی بھول کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ ہمیں اس تتلی کا پر تلاش کرنا ہے جو نامعلوم زمانوں میں ٹوٹا تھا، اور جس کی بے صدا آواز کو آس پاس کے لوگ سن نہ سکے۔

چبوترے پر بیٹھے ان تینوں نے دیکھا کہ جیسے جیسے وہ ہیولا کلام کرتا جاتا تھا، ہلکی، دودھیا سی روشنی کا ہالہ اس کے گرد رونما ہو رہا تھا۔ ریت کا ٹیلہ چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے شخص نے کہا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ دوسرے دو نے مخالفت کی۔ پہلے نے دونوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

ہمیں اپنی مٹی کو یاد رکھنے کی جنگ کرنی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں گئی؟ کوئی اسے لے گیا یا اس کے

Scanned with CamScanner

صفحوں سے حروف اڑ گئے، اور کاغذ ہواؤں کا رزق ہوئے۔ ہم یہ ضرور سوچیں گے کہ وہ کیسے کھو گئی۔ کہاں ہماری غفلت نے کام دکھایا، اور کہاں ہماری خطاؤں نے۔ کہاں ہماری بڑی خطا تھی، اور کہاں چھوٹی چھوٹی خطائیں گرد باد میں بدل گئیں، اور ہماری سب سے قیمتی متاع ہم سے کھوگئی۔ اس کے کھوجانے پر ہماری آنکھیں سوکھ گئیں۔ ہمارے حلق صحرا کی لکڑی بن گئے۔ ہمارے عناصر بدل گئے۔ ہم نے دنیا کے سب سے بڑے شر کا سامنا کیا۔ یہ حقیقت ہے، وہ اب ہم میں نہیں۔ اس کے نہ ہونے کا خیال، اپنے سب پیاروں کی موت کی حقیقت سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے بہت کچھ کھویا ہے۔ اپنے گھر کھوئے، اپنے مویشی کھوئے، اپنے بچے کھوئے۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کھوئے۔ ہم 'نہ ہونے' کی حقیقت کا غم جانتے ہیں، لیکن اس کے نہ ہونے کا غم، سب غموں سے بڑا ہے۔ لیکن ہم سب کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی وہ ہم میں نہیں؟ اس کی غیر موجودگی ہم سے سوال کرتی ہے کہ اس کے موجود ہونے کا مطلب کیا ہے؟ کیا وہ صرف کاغذ پر موجود تھی؟ کاغذ پر صرف حروف تھے، لفظ تھے، مثالیں تھیں، حکایتیں تھیں، احکام تھے۔ ہم میں سے کون تھا جو اس کے کسی لفظ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہو کہ وہ یہاں موجود تھی؟ سچ یہ ہے کہ سارے لفظ، ساری حکایتیں، سارے احکام اس کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ وہ ہمارے فہم سے عظیم تھی۔ ہمارا فہم جس عظمت کا تصور کرسکتا ہے، جب تک اس کی شکست نہ کرتی اپنی عظمت ظاہر نہیں کرسکتی تھی۔

شاگرد نے استاد سے پوچھا: سب سے بڑا سچ کیا ہے؟ استاد چپ ہوگیا۔ شاگرد پریشان ہوا۔ کیا وہ گستاخی تو نہیں کر بیٹھا؟ استاد کافی دیر چپ رہا۔ ادھر شاگرد کی حالت غیر تھی۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اس نے غلط سوال پوچھ کر گستاخی کی تھی۔ استاد، شاگرد کی حالت بھانپ گیا۔ سب سے بڑا سچ وہ ہے جو آدمی کو چپ کرادے۔ شاگرد نہیں سمجھا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ کیا بڑے سچ کا دوسرا نام خوف ہے؟ استاد نے کہا: نہیں۔ خوف تو سچ سے بھٹکاتا ہے۔ آدمی ڈر کے علاوہ بھی چپ ہوسکتا ہے۔ وہ کیسے؟ شاگرد نے پوچھا۔ استاد نے جواب میں شاگرد سے کچھ سوال کیے۔

Scanned with CamScanner

اگر کوئی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو تم اپنا نام، باپ کا نام، بستی کا نام، عمر، پیشہ بتاؤ گے نا؟

جی۔

سوال کرنے والا کہے کہ بس یہی تم ہو؟ تو تم سوچ میں پڑ جاؤ گے۔ تمھیں ایک مدھم سا احساس ہوگا کہ نہیں کچھ ایسا ہے جو نہ تو تمھارے نام میں سما سکا ہے، نہ تمھاری خاندانی شناخت میں، نہ تمھارے پیشے میں، نہ تمھاری صنف میں۔

جی۔ سچ کہا۔

تمھارا سچ کہاں ہے؟ کس مقام پر؟ کس لفظ میں؟ تم شاید کہو، علم کی جستجو میں تمھارا سچ موجود ہے۔ یا تمھیں اپنی نیکی کا خیال آئے، یا اپنی کامیابیوں کا۔

میرا سچ میری نیکی یا علم کی طلب میں نہیں۔ میری کامیابی میں بھی، ناکامی میں بھی نہیں۔

تو کہاں ہے؟

....

تم گنگ ہو جاتے ہیں۔ یہ گنگ ہو جانا، تمھاری بے بسی نہیں، تمھارا عجز ہے۔ اس سچ کی عظمت کا خیال کرتے ہی تم اپنی ہستی کے اس منطقے میں پہنچ جاتے ہو، جہاں نہ تمھارا نام ہے، نہ بستی ہے، نہ تم مرد ہو، نہ بوڑھے ہو نہ بچے ہو۔ تمھیں اپنے سارے علم، ساری شناختوں، ساری مانوس چیزوں کی نفی کرنی پڑتی ہے، پھر کہیں یہ کہنے کے قابل ہوتے ہو کہ تم نے کچھ کچھ خود کو سمجھ لیا۔

تمام بڑے سچ خاموشی میں ہیں۔

Scanned with CamScanner

سچ یہ ہے کہ اس کے سچ کو اب ہم نے کچھ کچھ سمجھنا شروع کیا ہے۔وہ اب ہم میں نہیں۔وہ غائب ہے۔ کچھ دیر کے لیے جرم کے اس احساس سے نکل آؤ کہ وہ ہماری غفلت یا خطا کے سبب غائب ہے۔بس یہ سمجھو کہ وہ غائب ہے۔ جب ایک عظیم چیز ہمارے سامنے ہوتی ہے تو ہم چیز کو دیکھتے ہیں،اس کی عظمت کو نہیں۔ چیز تو عام سی شے ہے۔ جب وہ غائب ہوتی ہے تو اس کا شے ہونا بھی غائب ہو جاتا ہے۔تب تم اس کی عظمت کو محسوس کرنے کے قابل ہوتے ہو۔تم دیکھتے ہو کہ عظمت شے میں سما ہی نہیں سکتی۔شے کا کنارہ ہوتا ہے،عظمت کا نہیں۔تم شے کو چھو سکتے ہو۔ جسے تم چھو سکتے ہو، وہ تمھاری دسترس میں بھی آ سکتی ہے۔تم اسے بدل سکتے ہو۔اس کا مطلب بدل سکتے ہو۔تم اسے دوسری شے سے بدل سکتے ہو۔لیکن کیا عظمت کو تم چھو سکتے ہو؟ جب تم کسی عظیم شے کے غائب ہونے کا تصور کرنے لگتے ہو تو تمھیں لگتا ہے جیسے تمھیں تپتی ریت پر ننگے پنڈے کے ساتھ لٹا دیا گیا ہو۔کیا تم تپتی ریت سے اٹھ کر بھاگ جاؤ گے؟ بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ جب تم تپتی ریت کو ننگی پیٹھ پر سہتے ہو تو اپنی ہستی کی ساری طاقت، ساری جمع پونجی،سارے اسرار کو تکلیف کی کاٹ دار لہر کے ساتھ بیدار ہوتا محسوس کرتے ہو۔تم موت کی غفلت سے بچنے کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہو جس کی تم میں استطاعت ہے،جس کی تم میں استعداد ہے۔عظمت کا تصور تم سے تمھارے وجود کی ساری طاقت،تمھارے تخیل کی ساری وسعت،تمھاری ہستی کا سارا اسرار چاہتا ہے،تا کہ تم جی سکو۔تا کہ تم وہ زندگی جی سکو،جس کی آرزو تم اپنے بہترین لمحوں میں کرتے ہو۔ جب تم دیکھتے ہو کہ تم ایک شے نہیں ہو،تمھارا کوئی کنارہ نہیں ہے۔تم دریا کی ایک لہر ہو،اس دریا کی جو تمھارے اندر بہتا ہے۔

تم دریا کے دوسرے کنارے کو دیکھتے ہو اور اگلے ہی پل

وہاں پہنچ جاتے ہو۔یہ فن تم نے کیسے سیکھا؟

یہ فن نہیں ہے۔

اچھا یہ سائنس کیسے سیکھی؟

یہ سائنس بھی نہیں۔

Scanned with CamScanner

اچھا، یہ کرامت کیسے کر لیتے ہو؟

یہ کرامت بھی نہیں؟

تو پھر کیا ہے؟

یہ جینے کا ڈھنگ ہے۔

جینے کا ڈھنگ؟؟

جی ہاں، لوگ فن، سائنس، کرامتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، لیکن جینے کے ڈھنگ کی طرف نہیں۔ وہ فطرت کے قوانین کو توڑنے، یا ان سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، لیکن جینے کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ نہیں دیتے، جو پہلے ہی سے ان کے اندر موجود ہے۔ تم نے ان دو آدمیوں کی کہانی سنی ہوگی، جن کی جان بخشی کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ وہ دو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بندھی رسی پر چل کر دکھائیں۔

نہیں سنی۔

تو سنو۔ دو نیک آدمی تھے۔ ایک کشتی پر سفر کر رہے تھے۔ ملاح ایک لڑکا تھا۔ جب کشتی کنارے کے قریب تھی تو اچانک ایک گرداب نے کشتی کو گھیرا۔ کشتی ڈولی، اور الٹ گئی۔ تینوں غوطے کھانے لگے۔ ملاح لڑکا، کشتی کے نیچے آ گیا۔ دونوں نیک آدمیوں نے کسی طرح ہاتھ پاؤں مار کر جان بچائی، مگر لڑکا ڈوب گیا۔ لڑکے کے باپ کو واقعے کا علم ہوا تو اس نے لڑکے کی موت کا ذمہ داران دونوں کو ٹھہرایا، اور انھیں اپنے قبیلے کے سردار کے پاس لے گیا۔

وہ لڑکا اتفاقاً کشتی کے نیچے آیا، ہمیں تو علم بھی اس وقت ہوا، جب ہم ہانپتے کانپتے کنارے پر پہنچے۔ دونوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

جب تم تینوں اکٹھے سفر کر رہے تھے تو تم تینوں ایک دوسرے کی ذمہ

Scanned with CamScanner

داری تھے۔تم بڑے بھی تھے،تم پر دہری ذمہ داری تھی۔سردار نے کہا۔

موت ہم تینوں کے سر پر تھی،ہم سب نے موت کے خلاف جنگ کی۔وہ ہار گیا۔ہمیں اپنی جنگ سے سانس بھر کی مہلت نہ ملی۔اس میں ہمارا جرم کہاں ہے؟

تمھارا جرم یہ ہے کہ تم نے صرف اپنی اپنی جان کو جینے کے قابل سمجھا،اور اسے باقی رکھنے کی جدوجہد کی۔تم نے انتہائی خودغرضانہ فیصلہ کیا۔تمھیں یہ خیال ہی نہ آیا کہ ایک لڑکا بھی تمھارے ساتھ ہے۔

لیکن کیا اس لمحے کسی دوسرے کو بچانے کا خیال آسکتا ہے؟ایک نیک آدمی بولا۔

یہ تمھارا دوسرا جرم ہے،اور سنگین تر۔یہ خیال صرف اسی شخص کو نہیں آسکتا جو ساری عمر اپنے بارے میں سوچتا رہا ہو۔اپنے بارے میں سوچتے رہنے سے بڑا جرم کوئی نہیں۔تمھاری سزا یہ ہے کہ کل تم دو پہاڑوں کے بیچ تنی رسی پر چلو گے۔بچ گئے یا مر گئے،تمھاری قسمت۔

جانتے ہو،اس کے بعد کیا ہوا۔ایک آدمی ساری رات اس پریشانی میں مبتلا رہا کہ ایک دفعہ موت کے منھ سے نکلنے میں تو کامیاب ہو گیا،لیکن دوسری مرتبہ ناممکن ہے۔وہ ایک لمحے کے لیے سو نہ سکا۔جب کہ دوسرے آدمی نے صرف اتنا سوچا کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔آج نہ سہی کل۔موت کا کل ایک دن آنا ہی ہے تو کیوں اپنی نیند برباد کریں۔وہ پرسکون سویا۔اگلی صبح ایک کی آنکھیں لال اور سوجی ہوئیں۔چہرہ پیلا۔ٹانگیں کانپتی ہوئیں۔جب کہ دوسرے نے پہاڑ،وادی،وادی پر کرنیں بکھیرتے سورج کو دیکھا اور لوگوں کو دیکھا اور کہا،واہ آج صبح کا نظارہ کس قدر دل کش ہے۔ان سب کے لیے یہ دن کتنا اچھا ہے،جن کی دنیا سے دو نام نہاد نیک لوگ ہمیشہ کے لیے نکل جائیں

Scanned with CamScanner

گے۔ وہ مسکرایا، سامنے پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا اور تنے ہوئے رسے پر چل پڑا۔ سب نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے چلتا ہوا، دوسرے کنارے پر سلامتی سے پہنچ گیا۔ جب کہ دوسرا پہلے ہی قدم پر موت کی وادی میں گم ہو گیا۔

کیا اس کے پاس تنے ہوئے رسے پر چلنے کا فن تھا؟

نہیں، اس کے پاس کوئی فن نہیں تھا۔ وہ پہلی مرتبہ رسے پر چلا تھا۔ اس کے پاس جینے کا ڈھنگ تھا۔ جینے کے ڈھنگ نے اسے بتایا تھا کہ جب تک جینا ہے، ڈھنگ سے جینا ہے۔ اس کی وضاحت مشکل ہے، اس لیے کہ وضاحت کی کوشش کریں گے تو کوئی فن، سائنس، نظریہ سامنے آ جائے گا۔ یہ ان سب سے الگ ہے۔ یہ ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ جینے کا ڈھنگ، ہر حال میں، ہر صورتِ حال میں، ہر طرح کے خطرات، ہر طرح کے دکھوں میں آدمی کی اسی طرح راہنمائی کرتا ہے جس طرح آنکھ، پاؤں کی راہ نمائی کرتی ہے۔

ہمیں ماننا ہوگا کہ ہماری مٹی میں اس دیوتا کا خون شامل ہے، جس نے شکست کھائی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ہم دیوتاؤں کی جنگوں کا نتیجہ ہیں، لیکن ہمیں اس حقیقت کو یاد رکھنا ہوگا کہ شکست کھانے کے باوجود وہ دیوتا سے کوئی اور مخلوق نہیں بنا تھا۔ ہم جلد حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ اس دیوتا کی شکست کا احساس ہمارے خون میں دوڑتا ہے۔

ہم نے اسے اب سمجھنا شروع کیا ہے۔ ہم نے سچ کا سامنا کرنا شروع کیا ہے۔ اس نے ہمیں باندھ رکھا تھا۔ ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔ ہمارے گرد ایک لکیر کھینچ رکھی تھی۔ ہم اس لکیر پر قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ہمارے لیے زندگی کا سارا مطلب اس لکیر کے اندر سمٹ گیا تھا۔ ہم اسی مطلب کو دہراتے رہتے تھے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دہراتے رہتے تھے۔ ہم اپنے بزرگوں کی زندگیوں کو دہراتے رہتے تھے۔ ہماری ہستی کی انتہا کیا تھی؟

تم دیکھو گے، رات کے اندھیرے میں کوئی تمھارے کان میں سرگوشی

Scanned with CamScanner

کرے گا۔تم سے کہے گا،اٹھو دیوار کے پار اتر جاؤ۔تم نے اس شخص کا حال نہیں سنا جو اپنے قبیلے سے بچھڑ گیا تھا۔وہ پہلے قبیلے کے قدموں کے نشان بھولا، پھر نام بھولا، پھر اپنے آپ کو بھول گیا۔

ہماری ہستی کی انتہا کیا تھی؟ پرکھوں کی ہڈیوں کی رکھوالی کرنا۔ہمارے کچے گھروں کی دیواریں مقدس ہیں، کیوں کہ ان پر ہمارے پرکھوں کی ہڈیاں ٹنگی ہوئی ہیں۔تمھیں وہ قصہ یاد ہوگا جب ایک نوجوان شکار پر گیا تھا۔وہ اکیلا رہتا تھا۔اس کے ماں باپ چند سال پہلے گزر گئے تھے۔پانی طوفان کی مانند برساتھا۔اس کے گھر کی دیوار گر پڑی تھی۔اس کے پرکھوں کی ہڈیاں پانی میں بہتی ہوئی گم ہوگئی تھیں۔وہ واپس آیا۔اس نے گریہ کیا۔شکار کے بھالے سے اپنا سینہ مجروح کیا۔سارا بدن لہو میں تر بتر ہوگیا۔سارا قبیلہ جمع ہوا۔اس کے لہولہو بدن کا خیال کسی نے نہ کیا۔کسی نے کہا کہ اسے مار ڈالا جائے ،اور اس کی ہڈیاں کتوں کو ڈال دی جائیں۔ پرکھوں کی ہڈیوں سے غفلت سے بڑا پاپ کوئی نہیں۔پاپی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔مگر بڑوں نے کتاب کو دیکھا اور کہا کہ قبیلے کے کتے بھی پاپی کی مردہ بوٹیاں نہیں کھا سکتے۔اسے قبیلہ بدر کردیا گیا۔پرکھوں کی ہڈیاں ہمیں اس قدیمی دنیا سے جوڑے رکھتی تھیں، جیسے ہم اپنے خوابوں میں کبھی کبھی دیکھ پاتے ہیں۔جب کبھی ہمارے خوابوں میں ہمارے بوڑھوں کی روحیں ہم سے ملنے نہیں آتی تھیں ہم اپنے گناہوں پر توبہ کرتے تھے،اور قربانی کرتے تھے۔ مگر راتوں کی تنہائی میں اس سرگوشی کو نہیں سنتے تھے، جو ہمیں اس دیوار کے پار جانے کے لیے کہتی تھی ،جس پر ہمارے پرکھوں کی ہڈیاں تھیں۔

ایک کچھوا بھٹک کر جنگل میں آگیا۔اس نے گلہری کو دیکھا۔گلہری نے اسے دیکھا۔

تم کون ہو،اور یہاں کیسے آئے؟

تم کون ہو،اور یہاں کیسے؟

دونوں کے پاس ایک جیسے سوال تھے،مگر دونوں کی حیرت مختلف تھی۔

کچھوا حیران تھا کہ کوئی جانور ٹانگوں کے ذریعے اوپر بھی جا سکتا ہے،اور گلہری

Scanned with CamScanner

حیران تھی کہ کوئی حیوان ٹانگے رکھتے ہوئے بھی اوپر نہیں جا سکتا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے سوال کے بعد ایک دوسرے کی حیرت جان لی۔

میں جہاں رہتا ہوں وہاں درخت نہیں ہوتے۔ کچھوا بولا۔

میں جہاں رہتی ہوں وہاں صرف درخت ہیں۔گلہری بولی۔

تم نے اگر نئی ٹانگیں حاصل نہ کیں تو تمھارا مر جانا یقینی ہے۔گلہری نے کہا۔

نئی ٹانگیں کہاں سے ملتی ہیں،تم نے کہاں سے حاصل کیں؟ کچھوا منمنایا۔

وہ تمھیں اس درخت کی چوٹی پر ملیں گی۔گلہری یہ کہہ کر درخت کی آخری شاخ پر پہنچ گئی۔

☆☆☆

آسمان اس قدر روشن، اس قدر مہربان کبھی نہیں ہوا تھا۔

انھوں نے اتنی دیر تک آسمان کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔

ان سب کے قدموں میں روشنی کی ندی سی بہنے لگی تھی۔وہ حیران ہوئے، وہ سہم گئے۔ابھی تو وہ اپنی اپنی ریت سے سمجھوتہ کرنے کا خیال کرنے کے قابل ہوئے تھے۔اتنی ساری روشنی نے انھیں ایک نئی صورتِ حال میں مبتلا کر دیا۔اتنی روشنی، اور وہ بھی ان کے ریت ہوتے قدموں میں؟ وہ اس کا کیا کریں؟ انھوں نے اتنی دیر تک اتنی ساری روشنی کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ان سب نے سامنے ان چاروں کی طرف دیکھا۔مگر وہاں شاید کوئی سایہ تھا، یا سایہ سا تھا، روشنی تھی یا روشنی نما تھی.....وہ ٹھیک طرح دیکھ نہیں پائے تھے۔

تمھارے پرکھوں کے پرکھوں کے زمانے کی بات ہے۔دو آدمی

Scanned with CamScanner

جنگل میں شکار کے لیے گئے۔ انھوں نے ایک جنگلی گائے دیکھی۔ ایک دائیں طرف ہوگیا، دوسرا بائیں جانب چلا گیا۔ دونوں نے جب گائے کو گھیر لیا تو کیا دیکھا کہ گائے کی ٹانگیں لمبی ہونے لگی ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ جہاں تک ان کی نظریں پہنچتی ہیں، گائے کی ٹانگیں پہنچتی ہیں۔ دونوں ڈر گئے، پر ایک نے اپنا بھالا گائے کی پچھلی ٹانگ پر کھینچ کے مارا، دوسرا گھر کی طرف بھاگا۔ جب پہلا گائے کو کھینچ کھانچ کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ دوسرے آدمی کی ٹانگ پر گہرا زخم تھا۔

اس کا کھو جانا واقعہ نہیں۔ سانحہ بھی نہیں۔ ہم نے واقعے اور سانحے دیکھ رکھے ہیں۔ ہمارے دکھوں کی ایک حد ہے، دکھوں کو سہنے کی بھی ایک حد ہے۔ اس کا کھو جانا ان حدوں سے کہیں آگے کی بات ہے، مگر یہ آگے کی بات اب ہو چکی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے آدمی کے بدن سے اس کی جلد کوئی کھینچ لے، اور ننگے بدن پر کوئی تپتی ریت ڈالتا جائے اور اس کی موت کو مسلسل ملتوی رکھے۔ کاش ہم سب کی موت کی سختی سہتے، موت کے ملتوی ہونے کی دہشت نہ سہتے! ان کے قدموں میں بہتی روشنی ان سے جیسے مخاطب تھی۔

ان سب نے بالآخر دیکھا کہ وہ چاروں چلے گئے، الگ الگ، جدا جدا سمتوں میں۔

کیا وہ اس کی تلاش میں گئے ہیں؟ ریت ہوتے سب لوگوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ایک ہی سوال پڑھا۔

☆☆☆

انھی میں سے ایک شخص اٹھا۔

وہ چلے گئے۔ انھوں نے جانا ہی تھا۔ ان کا جانا، کتاب کے جانے کے سانحے ...نہیں... میرے پاس لفظ نہیں..... ہمیں اب اپنے لفظ بنانے ہوں گے، اس دنیا کو بیان کرنے کے لیے..... جس دنیا کو ہم بھگت رہے ہیں، مگر جو ہماری نہیں.... ہماری نہیں تو کس کی ہے؟ اور کی دنیا میں ہم کیسے آگئے؟ کیسے آسکتے

Scanned with CamScanner

ہیں؟ اپنی دنیا رکھنے والے اتنے مہربان کب سے ہوگئے؟....نہیں یہ ہماری دنیا ہے....ہماری دنیا میں ہمارے سوا کون ہے؟ کون ہیں؟ ہیں تو سہی...وہ کیسے آگئے؟...وہ آئے اور ہمیں پتا ہی نہ چلا....پتا چل بھی جائے تو ہم کیا کرلیں گے.....ہم کچھ نہ کچھ کریں گے....ہمیں اپنے لفظ چاہییں.....لفظ مل گئے تو سمجھو ہمیں اپنی دنیا مل گئی....جس کے لفظ اپنے نہیں، وہ اوروں کی دنیا میں رہتا ہے...اپنے لفظ ملیں گے تو سب اپنے اپنے کٹورے اپنے اپنے پانیوں سے بھرنے لگیں گے.....یہ ہونا تھا....یہ ہوگیا، اس لیے ایک ہی راستہ بچا ہے کہ تسلیم کرلیں کہ یہ ہونا ہی تھا...یہ اٹل تھا.....ہم سب ایک کنویں سے پانی بھرتے تھے۔ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کنواں خشک ہوسکتا ہے..نہیں وہ کنواں خشک نہیں ہوا، وہ اچانک غائب ہوگیا...ہمیں ریت کرگیا...کون اس کا جواب دے گا؟ ہمارے پرکھوں نے زمانوں سے کنویں کا پانی پیا....پھر ہم ریت کیسے ہوگئے.....ہماری رگوں میں کنویں کے پانی کے علاوہ بھی کوئی شے شامل تھی .....یا کنویں کا پانی....ہم میں سے کوئی ہوگا، جس نے کنویں میں اپنا پانی شامل کردیا ہوگا.....کتاب میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا، لوگ کہیں گے، ان کے ذہنوں میں بھی وہی لفظ اترتے ہیں جو کتاب میں ہیں....وہ کتاب میں اپنے لفظ شامل کریں گے، اور کنویں کا پانی زہر بن جائے گا.....ورنہ ہم ریت کیوں ہوتے.....یہ اچانک ہم سب کے پاس اتنے سارے کٹورے کہاں سے آگئے....ہم سب کی کھوپڑیاں کٹوروں میں کیسے بدل گئیں....کنواں نہیں رہا....ہم ریت سہی، پر ہیں.......سب کے پاس اپنا اپنا کٹورا ہے... پر، اپنے اپنے پانی سے سب کٹورا کیسے بھریں گے؟....سب کے پاس اتنا پانی کہاں ہے؟ سب کے پاس اپنا پانی ہوتا ہی کہاں ہے؟.....سارے جھگڑے ہی اپنے اپنے پانی کے ہیں....تمھیں یاد ہوگا...کتاب میں لکھا تھا۔جس گھر میں ہر ایک کے پاس چھڑی ہوگی، وہ ایک دوسرے کا سر پھاڑیں گے۔کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ جس گھر میں زیادہ چھڑیاں ہوں گی وہاں سانپ بھی زیادہ آئیں گے، اور جہاں سانپ زیادہ ہوں گے، وہاں ہر ایک کی زبان پر زہر ہوگا...ہم اپنے کٹوروں کو تب تک خالی رکھیں گے، جب تک ان کٹوروں کا اپنا پانی نہیں پیدا ہوجاتا.....کٹورے پانی پیدا کرسکتے ہیں.....وہ پانی ضرور اس پانی سے جدا ہوگا جسے ہم اب تک ان میں بھرتے چلے آئے ہیں....اپنے پانی کا ذائقہ...وہی ہوگا جو اپنے خون کا ہوتا ہے.....اپنے خون کا ذائقہ....اپنی زندگی آپ جینے کا ذائقہ ہے، اور سب کا جدا

Scanned with CamScanner

جدا ہے.... یہ نیا ذائقہ ہوگا، کڑوا ہوگا، تلخ ہوگا، ترش ہوگا، پر سب کا اپنا اپنا ہوگا....اور اس میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش نہیں ہوگی....اب تک ہم نے ایک ہی پانی کا ذائقہ چکھا تھا....ہماری زندگی کس قدر آسان تھی.....دوسروں کے ذائقے کے ساتھ جینا کتنا آسان ہے.....مگر ہم سختی سہہ لیں گے.....میں سختی سہہ لوں گا.....جس کے کاندھے پر بوجھ نہ ہو، وہ سختی سہہ لیتا ہے...ہمارے پاس اپنے کٹوروں کا پانی ہوگا تو سب سختی سہہ لیں گے....اپنی موت کے ملتوی ہونے سے بڑی سختی کیا ہوسکتی ہے؟اور اس سے بڑی نعمت بھی ریت سے بنے ہوؤں کے لیے کیا ہوسکتی ہے!لیکن میں تو ریت سے اٹھ کر آ گیا ہوں....اپنا کٹورا ہو تو ریت کو بھی مات دی جاسکتی ہے۔

سب نے دیکھا کہ وہ ان میں سے اٹھ کر گیا تھا، مگر ان میں سے نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے اور اپنی باتوں کی لذت میں کھویا ہے...سب نے یہ بھی دیکھا کہ وہ پہلا شخص ہے، جسے کسی سے بات کرنے اور کسی کو مخاطب کرنے کی پروا نہیں ہے، اور جس کی باتوں میں کوئی ربط ہے نہ ترتیب، وہ پہلے کچھ کہتا ہے پھر کچھ، اپنے کہے کی تردید میں اسے عار نہیں۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جو چلتا ایک راستے پر ہے، نقشہ کسی دوسرے راستے کا رکھتا ہے۔

یہ عذاب، موت ہے۔

اس نے عجب فیصلہ کیا۔ سب نے روکا ٹوکا، اس نے کسی کی نہیں سنی۔ اس نے فیصلہ کیا، میں اپنی موت کا ذائقہ چکھوں گا۔ لوگوں نے پوچھا، کیسے چکھو گے۔ اس نے کہا، یہ ایک عظیم راز ہے، وہ نہیں بتا سکتا۔ اس نے ایک ایسا آئینہ بنایا، جس میں وہ اپنے عکس کو چھو سکتا تھا۔ اس نے گھر کی ایک دیوار پر آئینہ نصب کیا۔ اس کے سامنے آیا۔ اپنے عکس کو جیسے ہی چھوا، وہ خود بے جان ہوگیا۔ اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ شہر میں اس کا عکس پھرتا ہے، اور اپنے عکس ہونے کی لذت میں کھویا ہوا ہے۔ دوسرے اس لذت کی آرزو کرنے لگے ہیں۔

Scanned with CamScanner

دن چڑھ آیا تھا۔سب نے اپنی اپنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرا۔کچھ نے اٹھنے کی کوشش کی۔کچھ اٹھ کھڑے ہوئے، کچھ دوسروں پر جا گرے، اوران کی ریت میں دھنس گئے۔جو اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے کٹورے کی تلاش کرنے لگے، اور جو ابھی ریت تھے، انھیں سخت پیاس نے آن لیا۔وہ اس پیاس سے پہلے آشنا نہیں تھے!!

■•♦•♦•♦•■

Scanned with CamScanner

لوگوفوبیا

ویک اینڈ پر وہ اپنے بیوی اور بیٹے کے ساتھ شہر کے سب سے بڑے شاپنگ مال میں تھا، جس کا افتتاح چند دن پہلے ہوا تھا۔ آج کل دو ہی بڑی خبریں ہوتی ہیں۔ کسی بڑے مال، کسی ایمپوریم، کسی بڑی نمائش کا افتتاح اور درجنوں لوگوں کا اچانک کسی مصروف جگہ پر مارا جانا۔ ان دونوں میں ضرور کوئی تعلق ہے، جسے کوئی نہ کوئی بتائے گا اور وہ ایک بڑی خبر بنے گا۔ اس کی بیوی اور بیٹا ایک مشہور برانڈ کے کپڑوں کی دکان میں نئے ڈیزائن دیکھ رہے تھے، وہ دروازے کے باہر چہل قدمی کرتا ہوا ان کا منتظر تھا۔ اسے دکانوں کے اندر وحشت ہوا کرتی تھی۔ اسے لگتا کہ کپڑوں، جوتوں، جیولری ،میک اپ، کھانے پینے ،الیکٹرونکس کی اشیا، یہاں تک کہ کتابیں اور سٹیشنری بھی اس کی طرف دھاوا کرتی ہیں، اور اس کا سانس بند ہونے لگتا ہے۔ اسے کئی بار محسوس ہوتا کہ اگر وہ دکان میں زیادہ دیر رکا، چیزوں کو دیکھا، ان کو ہاتھ لگایا تو اس کی جون بدل جائی گی۔ وہ بھی ایک شے بن جائے گا۔ اسے جوتا، مشین، ٹائی، برگر یہاں تک کہ کتاب بننے سے بھی بے حد ڈر لگتا تھا۔ اس ڈر کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی جسے اس نے چھ سات سال کی عمر سے کوئی پندرہ سال کی عمر تک محسوس کیا تھا۔

وہ اپنے گاؤں سے چار میل دور دربار معصوم شاہ کے میلے میں جب پہلی بار گیا تو دوسری جماعت میں تھا۔ اس نے پہلی بار قبریں دیکھی تھیں۔ اس کے چچا نے بتایا کہ یہ مرنے والوں کے گھر ہیں۔ موت کا مطلب وہ سمجھتا تھا۔ کوئی چھ ماہ پہلے اس کا دو دن کا بھائی مرا تھا۔ جب وہ مزار کے اندر داخل ہوا، اور لوگوں کو دعائیں مانگتے دیکھا تو اسے شدت سے خیال آیا تھا کہ مزار کے گھٹے گھٹے ماحول

Scanned with CamScanner

میں، اوراوپر سے اتنے لوگوں کے ہجوم میں پیر سائیں کا دم گھٹتا ہوگا تو کیا کرتے ہوں گے۔ تب سے وہ قبر میں جانے سے ڈرنے لگا تھا۔ وہ نویں جماعت میں تھا جب اس نے اپنے بڑے بھائی سے اپنے ڈر کا ذکر کیا تو اس نے قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی ایک چپت اس کے دائیں گال پر لگائی۔ احمق، آدمی مرتا ہی اس وقت ہے جب اس کا سانس بند ہوتا ہے۔ لیکن اسے اس بات پر یقین کرنے میں کافی مشکل پیش آئی کہ قبر میں پڑے لوگ سانس نہیں لیتے۔ کوئی سانس لیے بغیر گھر میں کیسے رہ سکتا ہے؟ وہ سوچتا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ قبر میں لوگ نہ صرف سانس لیتے ہیں بلکہ انھیں گرمیوں میں پسینہ بھی آتا ہوگا اور وہ بعض چھوٹی قبروں کے پاس رک کر ان سے کافی ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ آخر انھیں اتنے چھوٹے گھر کیوں دیے گئے ہیں؟ وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتا۔ اسے کچی قبریں زیادہ اچھی لگتیں کہ ان میں کچھ نہ کچھ ہوا اور روشنی پہنچتی ہوگی۔ بس تھوڑا سا یہ ہونا چاہیے ان پر۔ اسے خیال آتا۔ کہیں یونیورسٹی میں پہنچ کر اسے یہ بات سمجھ آئی کہ اس کا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ موت کا مطلب نہیں سمجھتا تھا، اس کی الجھن یہ تھی مرنے کے بعد بھی آدمی، زندگی اور زندوں کے ساتھ تعلق کیسے رکھ لیتا ہے، یا ایک زندہ آدمی مرے ہوؤں کے ساتھ ایک جیتا جاگتا تعلق کیسے قائم رکھتا ہے؟ لیکن اسے یہ ماننے میں کبھی تامل نہیں ہوا کہ وہ سانس کے بند ہونے سے ڈرتا تھا۔

دکانوں اور شاپنگ مالوں میں جانے سے اسے لگتا تھا کہ وہ شے بنے گا تو اس کا دم مسلسل گھٹتا رہے گا۔

بیوی کے خیال میں وہ کلاسٹروفوبیا، میکانوفوبیا اور ڈیموفوبیا جیسے امراض کا شکار ہے، اور اسے کسی اچھے ماہر نفسیات سے مدد لینی چاہیے۔ بیوی کا یہ بھی خیال تھا کہ شہروں میں آنے والے دیہاتی اکثر ان امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ جواب میں کچھ نہ کہتا، البتہ مزید الجھن کا شکار ہو جاتا اور سوچتا رہتا۔ ویسے بیوی کو جواب دینے کے لیے اس کے پاس بڑی سادہ سی دلیل تھی، جو اس نے مدت پہلے گھڑی تھی، اور جسے اس نے کافی مؤثر پایا تھا۔ یہ کہ خوف کے خلاف لڑنا مشکل بھی ہے، اور بے معنی بھی۔ خوف کے ساتھ جینا سیکھ لینا چاہیے۔ وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر کہتا تھا کہ خوف ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اس کے خلاف لڑنے سے آپ خوف کو موقع دیتے ہیں کہ وہ چھپ کر، کسی دوسرے کونے سے، کسی

Scanned with CamScanner

نامعلوم مقام سے آپ پر حملہ کرے،لیکن خوف کے ساتھ جینے سے آپ اس کے چہرے، چال،اور ڈھنگ اوراس کی کمزوریوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔البتہ وہ کبھی کبھی یہ سوچ کرہنس پڑتا تھا کہ اسے بندد کانوں کی اشیا سے وحشت سہی، پر یہ سمجھ میں تو آتی ہے کہ وہ اس کی دنیا سے اسی طرح کا تعلق رکھتی ہے، جیسے وہ کالی بلی جس سے وہ بچپن میں وہ بہت ڈرا کرتا تھا، مگر اسے دیکھنے کی ضد بھی کیا کرتا تھا....مگر اس وحشت کے لیے کلاسٹروفوبیا، میکانوفوبیا، ڈیموفوبیا جیسے الفاظ خوفناک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔وہ اس بات پر خاصا دلگیر اور اداس ہو جاتا کہ وہ جس وحشت کو بھگت رہا ہے، اور جس سے وہ خاصا آشنا ہو گیا ہے، اور کچھ کچھ راحت بھی محسوس کرنے لگا ہے، اس وحشت کو ایک اجنبی ، بھاری بھرکم، اس کے ذہن میں ایک بھیانک قسم کی مرعوبیت کو پیدا کرنے والے الفاظ تلے دبا دیا جاتا ہے۔اسے اپنا سانس مزید گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔لیکن ایک اور بات بھی تھی۔اسے چیزوں سے وحشت میں ایک قسم کی ماورائیت محسوس ہونے لگی تھی۔وہ جب چیزوں سے خوفزدہ ہوتا تو خود کو ایک ایسی کیفیت میں پاتا جس میں آس پاس کی چیزوں، باتوں سے، اداسی کے ساتھ الگ ہونے، مگر انھیں زیادہ وضاحت سے دیکھنے اوران کے معنی کو جاننے کی وہ ایک انوکھی آسانی محسوس کرتا۔اس نے خود ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ ماورائیت ہے۔وہ اس ماورائیت کو کھونا نہیں چاہتا تھا، اوراس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔یہ کہ اسی کی بنا پر کئی ایسی چیزیں اور باتیں اسے گوارا ہوتی تھیں جو آدمی کو خودکشی جیسے انتہائی قدم پر مجبور کرتی ہیں۔

نفسیاتی اصطلاحیں اسے کس قدر خوفناک اجنبیت اور مضحکہ خیزی کا احساس دلاتی تھیں، اس کا ذکر اس نے ایک مرتبہ بیوی سے کیا۔اس نے کہا کہ اوہو، پہلے کیا کم تمھیں روگ تھے کہ اور لگا لیے۔تمھیں تو لوگوفوبیا اور وربوفوبیا بھی ہیں۔تم لفظوں سے بھی ڈرنے لگے ہو۔اس کے لہجے میں افسوس اور ہمدردی تھی۔میں اب زبردستی تمھیں کسی اچھے معالج کے پاس لے جاؤں گی۔اس نے بیوی سے جرح نہیں کی۔دوسری طرف یہ سچ تھا کہ واقعی کچھ لفظ اس کے دل میں ہراس پیدا کرتے تھے۔وہ جب بھی کوئی نیا لفظ سنتا تو اسے لگتا کوئی اسے اس کی گلی سے گھسیٹ کر کسی نامعلوم مقام پر لے جا رہا ہے۔اسے فوراً وہ لوگ یاد آجاتے، جنھیں نامعلوم لوگ، نامعلوم وجہ سے کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر غائب کر دیتے تھے۔ان میں سے کچھ واپس تو آجایا کرتے تھے، مگر نہ ان کی شکل پہچانی جاتی تھی، نہ ان

Scanned with CamScanner

کی شخصیت۔ وہ نامعلوم مقام پر غائب ہونے سے بری طرح ڈرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ یہ جو نئے لفظ، کسی آفت کی طرح نازل ہو رہے ہیں، وہ اس کے گھر میں، اس کی ذاتی زندگی میں بری طرح مداخلت کر رہے ہیں، اور اسے بے گھر ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ چیزوں سے وحشت کا تو وہ عادی ہو گیا تھا، مگر لفظوں کے ہراس نے اسے اندر سے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ لفظ چیزوں کی طرح ہی اسے محسوس ہونے لگے تھے، اور اسے لگتا تھا کہ اگر وہ انھیں برابر سنتا یا پڑھتا رہا تو وہ بھی اسی طرح کا ایک لفظ بن جائے گا اور باقی لوگوں کے دلوں میں ہراس پیدا کرے گا۔ اس نے یاد کیا کہ گزشتہ چند سالوں سے سیکڑوں نئے لفظ اس کے کانوں میں پڑے ہیں، اور اس کی آنکھوں سے گزرے ہیں، بالکل ان بہت سی نئی چیزوں کی طرح جو بڑے بڑے سٹوروں سے اس کے گھر میں پہنچنے لگی تھیں، اور اس کی وحشت میں اضافہ کرنے لگی تھیں۔ وہ ان کی وحشت سے کچھ نہ کچھ کام کی چیز اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر یہ نئے لفظ تو اس کے لیے ایک بڑی مصیبت بن گئے تھے۔ وہ انھیں بھلانے کی کوشش کرتا تو وہ مزید یاد آتے اور اپنے ساتھ مزید نئے لفظوں کو کھینچ لاتے۔ یہ بات کہیں زیادہ پریشان کن تھی کہ کوئی لفظ اکیلا نہیں آتا، کئی لفظوں کی فوج ظفر موج لے کر آتا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ دنیا میں اگر قیامت آئی تو انھی لفظوں کے ہاتھوں آئے گی۔ آخر دنیا کو اتنے سارے لفظوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ سوچتا۔ وہ یہ بھی سوچتا، دنیا نیوکلیائی ہتھیاروں کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچتی ہے، مگر لفظوں کے سلسلے میں اتنی لاپروا کیوں ہے؟

پہلے اس نے ٹی وی دیکھنا بند کیا، پھر کتابیں پڑھنا بند کر دی تھیں۔ اسے لگا تھا کہ کتاب پڑھنا آدمی کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسے کچھ عرصے سے کتابیں پڑھ کر عالم فاضل بننے والوں سے زیادہ عام لوگ زیادہ خوش نصیب معلوم ہونے لگے تھے، اور ان سے بھی زیادہ جانور اور پودے اپنی فطرت کے قریب محسوس ہونے لگے تھے، اور اس نے واقعی دن کا ایک حصہ پودوں اور پرندوں کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا تھا۔ پودے، پرندوں سے بھی زیادہ اچھے تھے کہ سرے سے کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ پرندے بھی بولتے ضرور تھے، اور ضرورت کے بغیر بھی بولتے تھے، مگر ان کی لفظ نما آوازیں گنی چنی تھیں۔ وہ آدمیوں کی طرح وہ لفظ نہیں بولتے تھے، جو کسی اور دنیا کی باتیں بتاتے ہیں۔ کتابوں میں

Scanned with CamScanner

کئی خرابیاں تھیں۔ بڑی خرابی یہ تھی کہ ان میں وہ باتیں ہوتی تھیں، جو اس کی جانی پہچانی دنیا سے متعلق نہیں ہوتی تھیں۔ وہ سوچتا کتابیں پڑھنے سے آدمی کا اپنی جانی پہچانی دنیا سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے، اور خود پر اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے، جنھیں وہ جانتا تک نہیں۔ ایک اور غضب بھی تھا کہ کتابیں پڑھنے سے آدمی مسلسل بدلنے کے ایک چکر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں اسے اپنے بیوی بچوں سے زیادہ ان لوگوں کی فکر ہونے لگتی ہے، جنھیں اس نے کبھی دیکھا تک نہیں ہوتا، نہ دیکھنے کا کوئی امکان ہوتا ہے، اور ہر کتاب پڑھنے کے بعد اسے لگتا کہ اسے ان باتوں کی فکر کھائے جا رہی ہے، جو حقیقی طور پر اس کی زندگی میں کبھی رونما ہی نہیں ہوئی ہوتیں۔ وہ خود کو ایک خیالی قید خانے میں محسوس کرتا۔ اسے ان لوگوں پر حیرت ہوتی جو کتابوں کی خیالی دنیا کو جنت کہتے تھے۔ جنت اگر خیالی ہے تو قید خانہ ہی ہے۔ یہ بات لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ کتاب کے بعد اس نے اخبار پڑھنا بھی بند کر دیا تھا۔

اس نے شاپنگ مال میں ٹہلتے ہوئے جس خیال کا اچانک غلبہ محسوس کیا تھا اس کا تعلق بھی کچھ کچھ لفظوں کے خوف سے تھا۔ اسے اچانک یہ خیال سوجھا، اور اس کے اعصاب پر جیسے طاری ہو گیا کہ سیکڑوں کتابیں پڑھنے کے باوجود اسے کچھ عام سے سوالوں کا جواب تک نہیں ملا۔ مثلاً اس سے خوشی اتنی جلدی کیوں رخصت ہو جاتی ہے؟ اس کی بڑی سے بڑی خواہش کے پورے ہونے کے بعد وہ پل بھر کے لیے خوش ہوتا ہے، پھر ایک مہیب خالی پن محسوس کرتا ہے۔ جیسے جیسے خواہشیں پوری ہوتی جاتی ہیں، یہ خالی پن ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ جیسے وہ جہنم نما گھراؤ کے کنارے کے قریب آتا جا رہا ہے، اور وہ وقت بعید نہیں جب وہ اس میں گر جائے گا۔ اپنے اتنے بھیانک انجام سے وہ خوفزدہ تھا۔ کیسی انوکھی بات ہے مجھے ایک عام سے سوال کا جواب کتابوں سے نہیں ملا۔ ایک سوال جو مسلسل آدمی کا پیچھا کرے وہ عام ہی تو ہوتا ہے۔ ابھی شام کے وقت، جبکہ روشنیوں نے دن کا سماں پیدا کر رکھا ہے، اس شاپنگ مال کے ایک بڑے برانڈ کے کپڑوں کی دکان کے آگے ٹہلتے ہوئے اسے یہ خیال ہوا کہ اس کے پاس سوالوں کے جواب تلاش کرنے کا ایک اور ذریعہ بھی تو ہے، اور وہ بھی اتنا پرانا، اتنا قریب۔ اس کا دھیان پہلے کیوں نہ اس طرف گیا، وہ حیران ہوا۔ اس کے خواب۔ یہ خیال

Scanned with CamScanner

اسے اس لیے بھی سوجھا تھا کہ کل رات اس نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا، جو اب تک اسے خاصی تفصیل کے ساتھ یاد تھا۔ اسے لگا کہ یہ خواب اسے یاد ہی اس لیے رہا ہے کہ وہ اس کے اندر اس خیال کو راسخ کر سکے کہ خواب بھی اسے ان سوالوں کے جواب دے سکتے ہیں، جو اس کے دل میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یوں بھی اس نے محسوس کیا کہ خواب سے زیادہ کوئی شے ذاتی نہیں ہوتی۔ کوئی مائی کا لال آدمی کے خواب کی دنیا میں داخل نہیں ہوسکتا۔

اس نے بیوی اور بیٹے سے کہا کہ وہ کافی پینے جا رہا ہے، جب وہ شاپنگ سے فارغ ہو جائیں تو اسے فون کر لیں۔

اس نے خواب کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

شام کا وقت ہے۔ وہ باہر نکلتا ہے۔ اکیلا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا سا سبز گھاس کا ٹیلہ ہے۔ اسے کچھ کچھ وہ ٹیلہ مانوس معلوم ہوتا ہے، مگر جو کچھ اس پر وہ دیکھ رہا ہے، وہ اس کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آیا ہوتا۔ ٹیلے پر ایک بہت بڑی توپ نصب ہے، جس کا رخ مشرق کی طرف ہے۔ کافی تعداد میں فوجی وہاں گھوم رہے ہیں، اور جلدی میں لگتے ہیں۔ وہ آگے جاتا ہے۔ زمین پر جگہ جگہ موٹے موٹے تار اور پائپ ہیں، جو شاید بارود سے بھرے ہیں، اسے یہ خیال آتا ہے۔ اسے یہ سب دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ کوئی بڑی جنگ شروع ہونے والی ہے۔ وہ مزید آگے جاتا ہے۔ اسے صرف فوجی اور موٹے تار نظر آتے ہیں۔ اس شہر کا کوئی آدمی کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ڈھلوان پر آتا ہے۔ پھر سڑک پر۔ آگے کچھ گھر ہیں، وہ ایک گھر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ڈر محسوس کر رہا ہے، مگر اس ڈر کا مقابلہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتا ہے، اور یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ ڈر کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ وہ گھر میں اپنی مرحومہ والدہ کو دیکھتا ہے۔ دونوں کوئی بات نہیں کرتے۔ وہاں سے نکلتے ہیں، سڑک پر سے ہوتے ہوئے وہ ایک اور جگہ پہنچتے ہیں، جہاں اس کی پہچان کے کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ ایک بڑی عمارت ہے۔ سب سہمے ہوئے ہیں، مگر سب کے چہروں سے عیاں ہے کہ یہ وقت بہت بھاری ہے، لیکن یہ گزر جائے گا۔ اس کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

یہ خواب یاد کرتے ہوئے وہ خود کو یقین دلا رہا تھا کہ خواب اس لیے سوال کا جواب دیتے ہیں

Scanned with CamScanner

کہ اس میں لفظ نہیں ہوتے، صرف تصویریں ہوتی ہیں، چہرے، منظر، عمارتیں ہوتی ہیں۔ کم از کم اس نے اب تک ایسے ہی خواب دیکھے تھے۔ لفظ سوچنے کی مشین ہیں، مگر تصویریں دیکھنے اور محسوس کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ایک لفظ کے اندر ٹھہراؤ نام کی شے نہیں، ایک تڑپتی مچھلی جیسی کوئی شے ہے یا کوئی بے حد شرارتی بچہ جو کسی شے کو اس کے مقام پر رہنے نہیں دیتا۔ مگر تصویر سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے، سوائے ان لوگوں کے لیے جو تصویر دیکھتے ہوئے لفظوں کی مشین چلاتے ہیں۔ خواب، لفظوں سے پیدا ہونے والے خسارے کی تلافی ہیں۔ اس نے سوچا۔ اس خواب نے مجھے بتایا ہے کہ میں ایک بڑی جنگ میں مبتلا ہوں۔ میرے اندر بارود بھرے تار ہیں، مگر دن کی روشنی میں ان سے ناواقف رہتا ہوں۔ کسی بھی لمحے اس بارود پر میرا پاؤں آسکتا ہے، وہ بڑی توپ کسی وقت بھی چل سکتی ہے، میری غلطی سے یا کسی اور کے غصے سے۔ وہ خواب کی اس اپنی مرضی کی تعبیر پر خوش ہوا۔ اسے لگا جیسے اس نے ایک بڑی گرہ کو کھولنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ کسی خوفناک حقیقت کا علم بھی آدمی کو خوشی دے سکتا ہے! کیسی انوکھی بات ہے! لیکن اگلے ہی لمحے اس نے محسوس کیا کہ یہ خوشی بھی بس پل بھر کے لیے ہے۔ پھر ایک نیا خلا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر لفظوں کے ذریعے سوچنے کی مشین میں پسنے لگا ہے۔ وہ خواب کی تصویروں کو لفظوں کے ذریعے دیکھنے اور سمجھنے لگا ہے۔ کیا لفظ سے آزادی کی کوئی صورت نہیں؟ کیا میں صرف تصویروں، منظروں کو دیکھ کر بس جی نہیں سکتا؟ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں کچھ تصویریں بننے لگیں۔ ہونہہ، اب لفظ تصویریں بھی بنانے لگے، مطلب تصویروں کی معصوم دنیا میں دخل دینے لگے، اور ان کے اندر بھی وہ تڑپتی مچھلی جیسی کوئی شے داخل کرنے لگے، جو انھیں مسلسل بے چین رکھتی ہے۔ کیا آدمی کی یہی تقدیر ہے؟ کیا میری تقدیر یہی ہے؟ اس کے جواب میں لفظوں کی مشین مزید تیز چلنے لگی، اور اس کا سر درد کرنے لگا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ ایک جوڑا کافی پیتے ہوئے ایک دوسرے میں محو تھا۔ کیا دونوں جو دیکھ رہے ہیں، اسی کو سوچ بھی رہے ہیں؟ میرے ساتھ تو ایسا اکثر ہوا ہے کہ میرا جسم کہیں ہوتا ہے، کسی جسم کے روبرو ہوتا ہے، اور ذہن کسی اور جسم کے لمس کو یاد کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے، اور اس کا آغاز لازماً کسی نہ کسی لفظ سے ہوتا ہے۔ یہ تو چوہری مصیبت ہے۔ جسم، لفظ، خواب، خیال۔ اس نے کافی کے مگ کو انگلیوں سے محسوس کرنے کی کوشش کی، اور اس کے ذائقے کو

پوری طرح محسوس کرنا چاہا۔اس نے کوشش کی کہ اسے کسی دوسری شے کا لمس اور ذائقہ یاد نہ آئے۔لیکن اس کی کوشش ہی اس کی مصیبت بن گئی۔وہ سرے سے لمس اور ذائقہ محسوس ہی نہ کرسکا، کیوں کہ پانچ سات خیالات بہ یک وقت یلغار کرنے لگے تھے۔اصل مصیبت کی جڑ ہی یہی ہے۔آدمی ایک لفظ سے جان چھڑانا چاہتا ہے تو ایک نیا لفظ آن وارد ہوتا ہے، ایک خیال سے خلاصی چاہتا ہے تو دوسرا خیال آن دھمکتا ہے۔ایک عورت سے طبیعت گھبراتی ہے تو دوسری عورت کی طرف توجہ جاتی ہے، پھر اس سے بھی طبیعت اوبھنے لگتی ہے۔یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔

کن گہری سوچوں میں گم ہو؟ ہم کتنی دیر سے تمھارے پاس کھڑے ہیں۔اس کی بیوی بولی۔

ہونہہ.....کچھ نہیں۔

چلیں چھوڑیں۔یہ بتائیں، ست رنگی کا یہ سوٹ کیسا ہے؟ وہ اشتیاق سے بولی۔

ست رنگی؟؟؟

اوہ، میں کل ہی تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔اب تم اس لفظ سے بھی ڈرنے لگے ہو۔بیوی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

■•◆•◆•◆•■

Scanned with CamScanner

نیا حکم نامہ

شہر کے حاکم نے ایک نیا حکم نامہ جاری کیا ہے۔ حکم نامے میں لکھا ہے کہ آج سے ہر شخص صرف وہی بات لکھے اور کہے گا، جو سامنے کی ٹھوس حقیقت کو بیان کرتی ہو۔ تمام ذو معنی اور مبہم الفاظ کے استعمال پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔

ہوا یوں کہ کچھ عرصے سے لوگ باتیں بہت کرنے لگے تھے۔ شہر میں جوں ہی کوئی واقعہ ہوتا، چھوٹا یا بڑا، لوگ اس پر لمبی چوڑی بحثیں شروع کر دیتے۔ کوئی اس کے سبب پر بات کرتا، کوئی اس کے نتائج کو موضوع بناتا، کوئی اس کی ذمہ داری کا سوال اٹھاتا، کوئی بس خیال آرائی کا شوق پورا کرتا۔ لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے، ایک دوسرے کو طاقتوروں کی طرف داری کے طعنے دیتے، دھمکیاں دیتے، کبھی کبھی گالم گلوچ اور پھر ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ ایک ہی دن میں اس واقعے کے گرد باتوں، خیالوں، رایوں کا ایک پہاڑ سا کھڑا ہو جاتا۔ شہر کے حاکم کے پاس روپیہ، بندوق، سپاہ، سب کچھ وافر تھا، جن کی مدد سے وہ لوگوں سے نپٹ سکتا تھا۔ اسے پریشانی اس پہاڑ سے ہو رہی تھی، جو ہر واقعے سے بڑھتا جا رہا تھا، اور کئی چھوٹے بڑے پہاڑی سلسلوں کو جنم دے رہا تھا۔ یہ پہاڑ کسی جگہ موجود نہیں تھا، جسے وہ گرا سکتا، یا خرید لیتا، یہ تو اس وقت ظاہر ہوتا، جب کوئی واقعہ رونما ہوتا۔

ایک سال سے کچھ کم عرصہ پہلے شام کے وقت ایک اقلیتی فرقے کے چار خاندانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی تھی، جس میں بیس کے قریب لوگ جل کر راکھ ہو گئے، زیادہ تعداد بچوں اور عورتوں کی تھی۔ اگلی صبح تک اس فرقے کے سب لوگ، جلنے والے گھر کی راکھ اپنے جسموں پر مل کر شہر کی

Scanned with CamScanner

ہر ہر گلی میں جا کر لوگوں کو دکھا رہے تھے، اور بتا رہے تھے کہ تم نے لکڑی کی راکھ دیکھی ہوگی، یہ دیکھو یہ انسانی جسم کی راکھ ہے۔ کچھ کے ہاتھ میں جلی ہوئی ہڈیاں تھیں، جن سے عجیب سی، بدحواس کر دینے والی بو اٹھ رہی تھی، اور جن پر جلا ہوا، سیاہی مائل سرخ گوشت کہیں کہیں نظر آتا تھا اور دیکھنے والوں کے اندر کراہیت، ہیبت، کچکچاہٹ اور ترحم آمیز ہولناکی کے ملے جلے جذبات پیدا کرتا تھا۔ وہ لوگ یہ ہڈیاں لوگوں کو دکھاتے اور کہتے کہ غور سے دیکھو یہ ویسی ہی ہڈیاں ہیں، جیسی تمھاری پنڈلی، سینے اور بازو کی ہیں، اور اندر سے سب ہڈیوں کا رنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ لگتا تھا کہ شام تک ہر گھر میں راکھ اور جلی ہوئی ہڈیوں نے باتیں اور بحثیں شروع کر دی ہیں۔ حاکمِ شہر نے کہیں روپے، کہیں بندوق اور کہیں سپاہ سے کام لے کر ان سب کو واپس گھروں میں بھیج دیا، اور جلنے والے گھر کی جگہ ان کا معبد تعمیر کرنے کی یقین دہانی کرا دی، اور انھوں نے ان جلی ہوئی ہڈیوں کو سرخ ریشمی کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ لیا کہ جیسے ہی معبد بنے گا، وہ انھیں ان طاقچوں میں سجائیں گے، جہاں ان کے نیک بزرگوں کی ہڈیاں سینت سینت کر رکھی جاتی تھیں۔ لیکن حاکم شہر نے دیکھا کہ ایک ہی دن میں شہر کی فضا میں ایک پہاڑ نمودار ہو چکا تھا۔ حاکم شہر کے ایک قریبی مشیر نے کہا کہ جہاں پناہ، جس دن آپ ان کے معبد کا سنگ بنیاد رکھیں گے، اسی دن یہ فرقہ آپ کو اپنا سب سے بڑا محسن سمجھنا شروع کر دے گا۔ راکھ مقدس ہو جائے تو آدمی کی موت دیوتاؤں کی حکمت سمجھ کر نہ صرف قبول کر لی جاتی ہے، بلکہ ایسی موت کی آرزو بھی کی جانے لگتی ہے۔ حاکم شہر کو مشیر کی بات سے تسلی ہوئی، اور اس کی نظر سے وہ پہاڑ اوجھل ہو گیا۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد ایک بازار کو آگ لگا دی گئی، جس میں پچاس کے قریب لوگ جلے، اور درجنوں دکانیں مع مال راکھ کا ڈھیر بنیں۔ اس بازار میں ایک ایسے پارسا شخص کی دکان تھی، جس نے ایک ایسے شخص کو اپنا مال فروخت کیا تھا، جس کے فرقے کے بارے میں اس علاقے کی انتظامیہ کا متفقہ فیصلہ تھا (اور جسے متعلقہ کوتوال کی خاموش حمایت حاصل تھی) کہ جو کوئی اس فرقے کے کسی بچے، بوڑھے، عورت، مرد، خواجہ سرا، یا ان سے ہمدردی کرنے والے کو بھی مال بیچے گا، اس کا قتل واجب ہوگا۔ اس تحریر کے پمفلٹ ہر ہر دکان پر پہنچائے گئے تھے، اور ہر دکان کے آگے انھیں چسپاں کیا گیا تھا۔ اس شخص نے اپنے ساتھی دکانوں کو قائل کیا کہ سوداگر کا مذہب ہوتا ہے، سوداگری کا نہیں۔

Scanned with CamScanner

سوداگری کسی کی قوت خرید دیکھتی ہے اس کی شکل صورت، مذہب، عقیدے، مسلک، رنگ وطن کو نہیں۔
بس چند ہی دنوں بعد اس پورے بازار کو دن دیہاڑے آگ لگا دی گئی۔ اس مرتبہ ہر ہر گلی میں اس علاقے کی انتظامیہ کے لوگ جلی ہوئی ہڈیاں لیے ہوئے نمودار ہوئے، اور لوگوں کو دکھانے لگے کہ دیکھو گناہ گاروں کی ہڈیاں کتنی بھیانک، کتنی ہیبت ناک ہو جاتی ہیں، ان کی روحیں جہنم کے سب سے اسفل طبقے میں اس سے زیادہ ہولناک صورت اختیار کریں گی۔ اس مرتبہ حاکم کو سپاہ، روپے، بندوق میں سے کسی کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ البتہ یہ اعلان کیا گیا کہ جلنے والے بازار کی جگہ بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی، اور یہاں حاکم کے لشکر کا ایک نیا صیغہ قائم کیا جائے گا، تاکہ اس علاقے کے انتظام کو زیادہ محفوظ اور زیادہ مئوثر بنایا جا سکے۔ تاہم ایک دن کے اندر اندر فضا میں وہی پہاڑ نمودار ہو چکا تھا۔ حاکم اور اس کے مشیروں وزیروں نے دیکھا کہ یہ پہاڑ جوں ہی ظاہر ہوا، اس کے پہلو میں پہلا پہاڑ زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔ ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر جلی ہوئی ہڈیاں لال انگارہ بنی نظر آ رہی تھیں، اور انگارے تھے کہ بڑھتے ہی جاتے تھے۔

حاکم شہر کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے وزیروں مشیروں کا اجلاس بلایا۔ سب اس پر متفق تھے کہ اصل مسئلہ واقعات نہیں، وہ تو ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ ایک مشیر نے تو یہ تک کہا کہ جہاں پناہ ہمیں اس شہر کی آبادی کو ایک حد میں رکھنا ہے، اگر لوگ ایک دوسرے کو نہ ماریں تو یہ کام ہمیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اصل مسئلہ ان واقعات کے بعد ہونے والی باتیں، چہ میگوئیاں، تبصرے، رائیں اور بحثیں ہیں۔ ہرا یرا غیرا اپنی رائے دینے لگا ہے۔ جو زبانیں ہمارے شہر کا نمک کھاتی ہیں، وہ ہمارے خلاف زہر اگلتی ہیں۔ جہاں پناہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ دوسرے مشیر نے چند باتیں اجلاس میں پڑھ کر سنائیں، جنھیں خفیہ والوں نے اکٹھا کیا تھا، اور جنھیں سن کر اجلاس کے تمام شرکا کو یقین ہو گیا کہ قیامت کی نشانیاں واقعی نمودار ہو چکی ہیں۔

قتل، خون، آگ، راکھ، زنا، چوری، ڈاکے، سنگدلی، حسد، رشوت، بددیانتی، بدکاری، نااہلی، چشم پوشی، دنیا میں جہنم، یہ ہے ہمارا شہر۔

کسی کو مارنا، خدا کے اختیار کو ہاتھ میں لینا ہے۔

Scanned with CamScanner

خدا مارتا ہے، قتل نہیں کرتا۔

خدا کے نام پہ دوسروں کا خون بہانا گناہ ہے۔

ہر غیر طبعی حادثاتی موت کا ذمہ دار کوئی نہ کوئی شخص ہے۔

ہر دوسرا شخص، پہلے شخص کا دشمن بنا ہوا ہے۔

اس دشمنی کا فائدہ کس کو ہے؟ یہ بات نہ پہلے مورکھ کو معلوم ہے، نہ دوسرے کو۔

آج یہ آگ ہمسائے کے گھر میں ہے، کل ہمارے گھر پہنچے گی۔

جو شخص جلی ہوئی ہڈی دیکھتا ہے اور چپ کر جاتا ہے، وہ اپنی ہڈی کا سودا کر چکا ہوتا ہے۔

اگر ذمہ داروں کو سزا، متعلقہ ادارے اور اشخاص نہیں دیں گے تو لوگ سزا جزا کا نظام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔

ہم سب پتھر دل ہیں جو آگ، راکھ، خون دیکھ کر بھی رات کو کھانا کھاتے اور اپنی بیویوں اور محبوباؤں کے پاس جاتے ہیں۔

جب سے لوگ بے موت مرنے لگے ہیں اور ان کے گھر دکانیں جلنے لگی ہیں، کچھ لوگوں کے گھر محل نما نظر آنے لگے ہیں، اور وہاں چہل پہل بڑھ گئی ہے۔

جب شہر میں قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو جائیں تو حاکم کا فرض ہے کہ وہ سخت عملی قدم اٹھائے۔ وزیر نے حاکم سے مئودبانہ عرض کی۔ ایک اور وزیر نے کہا کہ جناب عالی! اگر ہم نے اس پہاڑ کو زیروزبر نہ کیا تو یہ آتش فشاں بنے گا اور ہم سب راکھ۔ یہ اجلاس اس نتیجے پر پہنچا کہ رائی جیسے واقعے کو پہاڑ بنانے کا ذمہ دار وہ سارے لفظ ہیں جنھیں لوگ اپنی اپنی بک بک میں دن رات استعمال کرتے ہیں۔ کچھ مدت پہلے تک یہ سمجھا گیا تھا کہ لوگوں کو بک بک کرنے دی جائے، اس سے وہ غصہ اور رنج نکل جائے گا جو انھیں توڑ پھوڑ پر آمادہ کرتا ہے، لیکن اب یہ خیال کیا جانے لگا تھا.....اور اس کے ساتھ وہ پہاڑ نظر آنے لگا تھا...کہ زیادہ باتیں کرنے سے غصہ اور رنج بڑھتے ہیں۔ اس کا سبب ایک خاص واقعہ تھا۔ ہوا یہ کہ جہاں پناہ کے حضور ایک شخص لایا گیا جو ہر وقت گلیوں میں اپنے رشتہ داروں کی غیبت کرتا رہتا تھا۔ جہاں پناہ نے اسے ایک انوکھی سزا دی۔ اسے شہر کی مصروف شاہراہ پر ایک پنجرے میں بند

Scanned with CamScanner

کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ وہ ہر وقت غیبت کرتا رہے، جیسے ہی چپ ہو، اسے دس درے مارے جائیں۔ ایک ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہاں گزرنے والوں کو یقین ہو گیا کہ اس کے رشتہ داروں نے اس کی زمینیں واقعی ہتھیائی تھیں، اور اس کی بیوی کو ورغلایا تھا۔ کچھ سر پھرے نوجوانوں نے اس کے رشتے داروں کو مارا پیٹا بھی۔ زیادہ بک بک ہی رائی کا پہاڑ بناتی ہے، اور وہ پہاڑ آتش فشاں بن سکتا ہے۔ لٰہذا پہلے تو یہ سوچا گیا کہ تمام رعایا کی زبان بندی کر دی جائے؛ کسی کو کچھ بولنے، لکھنے، کہنے کی آزادی نہ ہو.... شاہی طبیب سے یہ تک کہا گیا کہ وہ کوئی ایسی دوا تیار کریں کہ جسے رعایا کی خوراک میں شامل کر دیا جائے اور جس کے نتیجے میں ان کے بچے بغیر زبان کے پیدا ہوں، مگر ایک مشیر نے رائے دی کہ یہ زیادہ خطرناک ہے۔ زبان نہ ہو، پابند ہو تو ذہن اور ہاتھ پاؤں زیادہ تیزی سے چلتے ہیں، جیسے ہم جانوروں میں مشاہدہ کرتے ہیں، اور لوگ اشاروں کی ایک ایسی زبان ایجاد کر سکتے ہیں، جسے ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ ان کی زبان نہیں سمجھیں گے تو ان پر اختیار کھو دیں گے۔ آخر یہ طے کیا گیا کہ ''کسی واقعے کے بعد، یا واقعے کے بغیر بھی لوگوں کو بحث کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ نیز آج سے ہر شخص صرف وہی بات لکھے اور کہے گا، جو سامنے کی ٹھوس حقیقت کو صرف ایک ہی طریقے سے بیان کرتی ہو۔ کسی بھی واقعے سے متعلق شاہی بیان کو حتمی سمجھا جائے گا۔ رائے زنی کے لیے بھانت بھانت کے طریقوں کی ہرگز اجازت نہ ہو گی۔ البتہ شاہی بیان کی اس حکمت کو سراہنے کی اجازت ہو گی، جس کا اجمالی ذکر شاہی بیان میں کیا جائے گا''۔

لوگوں کی راہنمائی کے لیے 'ٹھوس حقیقت' کی مختصر وضاحت بھی حکم نامے میں درج کر دی گئی تھی۔ صرف اس حقیقت کو ٹھوس سمجھا جائے گا، جسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکے گا، اور جسے سب لوگ ایک ہی طرح سے بیان کیا کریں گے، اور جس کی شاہی تصدیق کی جائے گی۔ آج کے بعد ہر بات، ہر واقعے، ہر چیز کو ایک ہی طرح سے بیان کرنے کا طریقہ رائج کیا جائے گا۔ حکم نامے میں یہ بھی درج ہے کہ قاضی کو ایک نیا اختیار دیا جا رہا ہے۔ وہ ان سب کو سزا دے گا..... اور یہ سزا وہی ہو گی جو غداری کی ہوتی ہے، اور اس سزا کو دہرانے کی ضرورت نہیں..... جو ٹھوس حقیقت کو سرکار کے طے کردہ طریقے سے ہٹ کر بیان کریں گے۔ صرف اس قاضی کو اختیار ہو گا کہ وہ یہ طے کرے کہ حقیقت کو بیان کرنے کا

Scanned with CamScanner

واحد طریقہ کیا ہے؛ اسی کو شاہی طریقے کا مرتبہ حاصل ہوگا۔ قاضی، حاکم شہر سے راہنمائی لے کر وقتاً فوقتاً حقیقت کو بیان کرنے کے یکساں طریقے مشتہر کرتا رہے گا۔ لوگوں کی آسانی کے لیے حکم نامے میں ایک مثال بھی درج کر دی گئی تھی۔ 'آج شہر میں پانچ لوگ مرے'۔ کوئی شخص 'مرے' کی جگہ قتل، شہید، آں جہانی، ہلاک، کشتہ، ذبح جیسے الفاظ استعمال نہیں کرے گا، جب تک کہ حاکم اور قاضی کی طرف سے کوئی نئی ہدایت سامنے نہیں آتی۔ بعد میں قاضی نے اس پر حاشیہ لکھا کہ 'مرے' کا لفظ ایک غیر جانب دار لفظ ہے۔ جب کہ قتل اور شہید جیسے الفاظ کھلے انداز میں اشارہ کرتے ہیں کہ کسی شخص کو سنگ دلی اور وجہ کے بغیر، محض طاقت کے نشے میں مار ڈالا گیا، یا کسی شخص نے کسی عظیم مقصد کے لیے بخوشی اور سعادت سمجھ کر جان دے دی، اور طاقت ور کے جبر و جور کی پروا نہ کی۔ ہمیں ایک ایسی نئی زبان کی ضرورت ہے، جس میں نہ تو جانب داری ہو، اور نہ اس میں کسی طبقے، کسی شخص، یا کسی شخص کی نیت، یا اس کے کسی جذبے اور احساس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ جس طرح درخت سے پتا گرتا ہے تو وہ نہ قتل ہوتا ہے، نہ شہید، نہ ہلاک، وہ فطرت کا ایک سادہ سا عمل ہے۔ ہم شہر میں فطرت کے اصولوں کے تحت چلنا چاہتے ہیں، اور زبان کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ ہمارے شہر میں اس وقت استعمال ہونے والی زبان فطرت کے اصولوں سے روگردانی کرتی ہے۔ (اس حاشیے پر ایک بزرگوار نے گھر میں بیٹھ کر تبصرہ کیا کہ اگر میں قاضی کا گلا دبا دوں تو قاضی مرے گا یا قتل ہوگا، اور زوردار قہقہہ لگایا)۔

حاکم شہر کے فرمان میں آگے کچھ اور ہدایات بھی درج ہیں: اگر کوئی شخص اس بات پر بحث کرتا پایا گیا کہ حقیقت ٹھوس کے علاوہ بھی ہوتی ہے، اور اسے آنکھوں کے علاوہ ذہن سے، یا کسی ماورائی ذریعے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، یا یہ کہ حکم نامہ کیوں جاری کیا گیا ہے تو وہ مستوجب سزا ہوگا۔ لوگوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کیوں، کس لیے اور کیسے جیسے متنازع لفظوں کو استعمال کرنا ترک کر دیں۔ تمام شہریوں کو یہ ہدایت بھی کی جاتی ہے کہ وہ ہر روز صبح کا آغاز اس حکم نامے میں درج ہدایات کو پڑھنے سے کریں۔ جو کچھ اب تک سیکھا تھا، اسے لوح ذہن سے کھرچنے کا باقاعدہ عمل کریں۔ اپنے بچوں کو اس حکم کا ایک ایک لفظ یاد کرائیں، اور ان کے سامنے کوئی ایسا لفظ نہ بولیں، جس کے ایک سے زیادہ معنی ہوں۔ جہاں اس بات کا اشتباہ ہو کہ ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہو سکتے ہیں، انھیں اس وقت تک

Scanned with CamScanner

بولنے سے احتراز کیا جائے، جب تک قاضی فیصلہ نہیں کر دیتا کہ اس لفظ کا واحد معنی کیا ہوگا۔ لوگوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے تمام الفاظ کی فہرست قاضی کو فی الفور مہیا کریں، جن کے معانی ایک سے زیادہ ہیں، یا زیادہ ہونے کا شائبہ ہے، یا امکان ہے کہ ان کے ایک سے زیادہ معانی کسی بھی وقت، کسی بھی صورت حال میں لیے جاسکتے ہیں۔ ہر شخص کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو قاضی کی عدالت میں لے جائے، جسے اس نے اس حکم سے ہٹ کر بات کرتے سنا ہو، یا اس نوع کی اس کی کوئی تحریر دیکھی ہو۔

حکم نامہ ہر گھر کی دیوار پر چسپاں کر دیا گیا۔

پہلے پندرہ دن قاضی کی عدالت میں کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ یہ بات حاکم شہر اور قاضی دونوں کے لیے موجب حیرت تھی۔ اس دوران میں شہر میں چوری، زنا، قتل، ڈکیتی، رہزنی کے کئی واقعات ہوئے، مگر کوئی شخص مقدمہ لے کر قاضی کی عدالت میں نہیں آیا، اور نہ کہیں احتجاج ہوا۔ یہ بات حاکم شہر کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ اسے فضا میں وہ پہاڑ نظر نہیں آیا۔ اسے خفیہ پولیس کے کارندوں سے معلوم ہوا کہ لوگ ایک دوسرے سے کم بات کرتے ہیں، اور کچھ ایسے لفظ استعمال کرنے لگے ہیں جن کا مطلب وہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور اپنے جھگڑے خود فیصل کرنے لگے ہیں۔ یہ بات حاکم اور قاضی دونوں کے لیے باعث تشویش تھی۔ حاکم شہر نے اپنے حکم نامے میں ایک نئی شق کا اضافہ کیا کہ لوگ کوئی نیا لفظ نہیں گھڑیں گے، اپنے جھگڑے خود نہیں چکائیں گے، اور ہر واقعے کی اطلاع سرکار کو دی جائے گی۔

ایک ہفتے بعد قاضی کی عدالت میں ایک لڑکی، اپنے والد کے ہمراہ پیش ہوئی۔ لڑکی نے قاضی کو اپنی خون آلود شلوار دکھائی، کمر اور رانوں پر پڑی خراشیں دکھائیں۔ قاضی سمجھ گیا، مگر پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ لڑکی نے کہا، حضور آپ قاضی ہیں، حاکم کے بعد آپ کو ہماری جانوں پر اختیار ہے۔ آپ بتائیے کہ اس عمل کو کیا کہا جائے؟ میں کن لفظوں میں فریاد کروں؟ قاضی سوچ میں پڑ گیا۔ پوچھا۔ وہ کون شخص ہے؟ لڑکی کے والد نے کہا وہ حاکم کی سپاہ میں سے ہے۔ لڑکی بولی جب اس نے مجھے لہولہان کیا ہے تو اس وقت وہ کیا تھا، اس کا فیصلہ بھی آپ کیجیے۔ قاضی مزید سوچ میں پڑ گیا۔ پھر پوچھا، کوئی گواہ؟ لڑکی کا

Scanned with CamScanner

والد بولا، حضور میں اپنی بیٹی کے حق میں اور اس کے خلاف گواہی دیتا ہوں۔ قاضی نے پوچھا، جب تم خود دیکھ رہے تھے تو سپاہی کو روکا کیوں نہیں؟ حضور گواہ کا کام اب تک دیکھنا تھا، روکنا نہیں؛ آپ چاہیں تو گواہ کا کام اور مطلب نیا مقرر فرمادیں۔ قاضی کی بھنویں تن گئیں، مگر خاموش ہوگیا۔ سپاہی کو طلب کیا گیا۔ پوچھا۔ تم نے لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟ سپاہی بولا: جناب آپ میرے منھ پر لگی خراشیں دیکھ لیجیے۔ قاضی نے کہا، میں کمر پر لگی خراشیں بھی دیکھ چکا ہوں، وہ زیادہ بڑی اور گہری ہیں۔ تمھیں مزید کچھ کہنا ہے؟ قاضی نے پوچھا۔ سپاہی چپ ہوگیا۔ ''گویا تم اپنا جرم قبول کرتے ہو''، قاضی نے کہا۔ سپاہی نے فوراً کہا، جناب جرم کا لفظ کسی کو مارنے، چوری کرنے، رہزنی، ڈاکے، ٹھگی، کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے، رشوت سب کے لیے مستعمل ہے۔ پہلے جرم کا ایک معنی طے فرمایئے جو کسی ایک ٹھوس حقیقت کو بیان کرتا ہو۔

تمھارے مقدمے کا فیصلہ دو دن بعد ہوگا۔ قاضی نے کہا، اور عدالت برخاست کردی۔

اس کا فیصلہ مثال قائم کرے گا، اور آج کے بعد اس عمل کو وہی سمجھا جائے گا، جو وہ طے کرے گا، اس خیال نے قاضی کو خوش بھی کیا اور مشکل میں بھی ڈالا۔ اس نے اپنے بااختیار ہونے کا نیا گھمنڈ محسوس کیا۔ بادشاہ کو لوگوں کی زندگیوں پر اختیار ہے مگر مجھے لفظوں اور ان کی اندر کی دنیا پر بھی اختیار ہوگا۔ میرا اختیار بادشاہ کے اختیار سے بڑا ہوگا۔ کسی کی جان لینا چھوٹا اختیار ہے، لیکن کسی کی جان لینے کے عمل کو ایک نیا مطلب دینا بڑا اختیار ہے۔ مرنے کے بعد اگر کوئی چیز موت کو قابل قبول، یا قابل نفرت بناتی ہے تو وہ اس موت کا معنی ہی ہوتا ہے۔ یہ اختیار میرے پاس ہوگا۔ قاضی نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور دل میں تشکر وتفاخر کے جذبات محسوس کیے۔ بادشاہ جس پہاڑ سے ڈرتا ہے، میں نہ صرف اسے سر کروں گا، بلکہ اس کا ذرہ ذرہ میری دسترس میں ہوگا۔ اس بار قاضی نے اپنی مونچھوں کو بل دیا۔

قاضی کو مقدموں کا فیصلہ کرنے میں کبھی دیر ہوئی تھی، نہ وہ تذبذب کا شکار ہوا تھا۔ مدعی اور مدعا الیہ کو سنا، گواہوں کے بیانات کا جائزہ لیا، اور قانون کے مطابق ایک فریق کے حق میں مقدمہ فیصل کردیا۔ اس کے لیے قانون کی کتاب ریاضی کی ایک کتاب کی مانند تھی۔ پہلی بار قاضی کو یہ کتاب ایک معما سا، یا شاعری کی کتاب کی مانند نظر آئی، جس میں ابہام ہو۔ وہ پہلی بار تذبذب میں مبتلا

Scanned with CamScanner

ہوا۔تذبذب قاضی کے لیے قہر ہے،ایک لمحے کو اس نے محسوس کیا۔اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ قہر کا شکار تھا۔اس کے دل میں یہ شکایت بھی پیدا ہوئی کہ یہ کیسا ستم ہے،عمل کوئی کرے اور اس عمل کو سمجھنے نہ سمجھنے کے قہر سے کوئی گزرے۔وہ گھر کے وسیع دالان میں تخت پر بیٹھے بیٹھے یہ سب سوچ اور محسوس کر رہا تھا۔پھر اسے خیال آیا کہ یہ تذبذب تو اس اختیار کو استعمال کرنے کا صرف پہلا مرحلہ ہے،اسے پریشانی اس لیے ہو رہی ہے کہ وہ فیصلے کرنے سے پہلے لفظوں کے مطالب پر اس قدر غور کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے اپنے اختیار کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش کی۔وہ طے کرے گا کہ جرم کیا ہوتا ہے ...وہ طرح طرح کے واقعات کی ایک گٹھڑی باندھے گا،اس پر لکھے گا،جرم،اور آئندہ سب لوگ اس گٹھڑی کو اس کے دیے ہوئے نام سے پکاریں گے ...اسے لوگوں کی زبانوں،ذہنوں،بات چیت ،تبصروں،رایوں سب پر اختیار ہوگا۔وہ مسکرایا...لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جیسے ہی اس نے یہ گٹھڑی باندھنے کی کوشش کی،وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ اصل میں ایک ایسے پہاڑ پر چڑھ رہا تھا،جس کی چوٹی پر ہڈیوں کے انگارے تھے۔

جرم کیا ہے؟ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں ایک طرف گناہ،قانون شکنی،ظلم جیسے الفاظ وارد ہوئے،دوسری طرف جلی ہوئی ہڈیاں،لہو رنگ کپڑے،زخمی رانوں کی شبیہیں ظاہر ہوئیں..یہ کیا؟ جرم کہاں ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔جرم کی ٹھوس حقیقت کیا؟ اس نے خود سے دوبارہ سوال کیا۔جب وہ زیادہ الجھنے لگا تو اس نے اپنے اس منطقی طریقے سے کام لیا،جسے اس نے قانون کا مطالعہ کرنے کے دوران میں سیکھا تھا۔اس تخت کی ٹھوس حقیقت ہے،میں اسے ہاتھ لگا سکتا ہوں،کوئی دوسرا ہاتھ لگا سکتا ہے،شام کے وقت اس کا لمس خنک ہے،اور یہ سب کے لیے ایک جیسا ہے۔لیکن کیا واقعی؟ اگر کسی کا ہاتھ زخمی ہو تو پھر بھی یہ خنک ہوگا یا خشک کانٹے کی طرح؟ اس کے منطقی ذہن نے سوال اٹھایا۔وہ پھر پریشان ہوا۔یہاں کیا کوئی شے ایسی ہے جو سب کے لیے یکساں ہو؟ جو سب کو ایک جیسی نظر آتی ہو، ایک جیسی محسوس ہوتی ہو؟ اس سوال کے جواب میں اسے فوری طور پر کچھ نہ سوجھا۔لیکن پہلے یہ تو طے کرو کہ'سب' سے کیا مراد لے رہے ہو؟ اس کے منطقی ذہن نے ایک نیا قضیہ کھڑا کیا۔کیا تم ایک لفظ'سب' میں دنیا نہ سہی،اس شہر کے سب مردوں،عورتوں،بچوں،بوڑھوں،زنخوں،بیماروں،غریبوں،امیروں،

Scanned with CamScanner

افسروں، سپاہیوں، مشیروں، وزیروں، اور بادشاہ کو شامل کر سکتے ہو؟ تم ان سب کے تجربے کے لیے، جس کا تم صرف مبہم سا خیال کر سکتے ہو، اس ایک لفظ کا استعمال کرنے میں کتنے حق بجانب ہو سکتے ہو؟ جوں ہی اس نے وزیروں، مشیروں اور بادشاہ کا خیال کیا، اسے اپنی حماقت کا خیال ہوا۔ وہ 'سب' میں شامل کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس کے منطقی ذہن نے فیصلہ سنایا کہ کوئی ایک 'سب' نہیں ہوتا، چھوٹے چھوٹے کئی 'سب' ہوتے ہیں۔ بادشاہ جس کو چاہے پھانسی چڑھا دے، لیکن کوئی دوسرا آدمی یہ عمل کرے تو سزا پائے۔ میرے تخت کا پایہ صندل کا مگر جہاں پناہ کے تخت کا پایہ سونے کا ہے۔ لکڑی اور طرح خنک ہوتی ہے اور سونا دوسری طرح!..... لیکن جرم کیا ہے؟ اسے یاد آیا کہ اسے اس کا فیصلہ کرنا ہے۔

کچھ دیر مزید سوچنے کے بعد اس نے قلم اٹھایا، اور لفظ جرم لکھا۔ اسے ذرا سا اطمینان محسوس ہوا۔ اس لفظ کو سب لوگ ایک ہی طرح سے پڑھیں گے۔ بچے، بڑے، بوڑھے، مرد عورت، بادشاہ، مشیر وزیر، اور میں۔ اس نے اپنی ذہانت کو خود ہی داد دی۔ لیکن اس کا منطقی ذہن ابھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ اگر بچے ہی نے پوچھا کہ وہ جرم کا لفظ پڑھ سکتا ہے، سمجھ نہیں سکتا تو اس کا کیا مطلب ہوگا.... یہی نہ کہ جو کچھ صفحے پر ہے، آدھا ہے، یا آدھے سے بھی کم، باقی وہاں ہے، جہاں .... جہاں جانے اور جسے بدلنے کا اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ مجھے وہ دنیا اس صفحے پر لے آنی ہے، نہیں، صفحے پر لکھے اس لفظ میں لے آنی ہے، نہیں صرف لے ہی نہیں آنی، اسے یک رنگ بنانا ہے، سب کے لیے۔ اسے ایک بار پھر وہی پہاڑ نظر آیا، اور اس مرتبہ وہ بہت دور نظر آیا، اس کی چوٹی سرخ رنگ کی تھی، مگر نوکیلی ہوگئی تھی۔ مجھے یہ پہاڑ سر ہی نہیں کرنا، اسے لفظ کے اندر لے آنا ہے، اور ایک ایسے طریقے سے کہ سب کو ایک جیسا دکھائی دے۔ کیا میرے پاس کوئی جادوئی طاقت ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے بہت سال ہوئے، ایک کتاب پڑھی تھی، جس میں کچھ منتر درج تھے، وہ اسے سمجھ نہ آئے تھے، مگر کتاب میں لکھا تھا انھیں دہراتے رہنے سے وہ سب کچھ ہو سکتا تھا، جس کی تصویر منتر پڑھنے والا اپنے ذہن میں بناتا تھا۔ جیسے ہی منتر کے لفظ سے تصویر ننھی ہو کر ذہن میں واضح ہو جاتی تھی، باہر وہ واقعہ رونما ہو جاتا تھا۔ اسے یاد آیا اس نے وہ منتر، اپنے ایک دوست کی موجودگی میں، اپنی ران پر آزمایا۔ اس نے ران میں سوئی چبھوئی، اور منتر کے الفاظ دہراتے ہوئے ذہن میں اپنی ران کو درد اور خون کے بغیر دیکھا۔ وہ

Scanned with CamScanner

یہ دیکھ کر حیران تھا کہ نہ تو درد ہوا، نہ خون نکلا، مگر سوئی ران کی موٹی جلد کے آر پار تھی۔ اسے لگا کہ وہ لفظ جرم کے ساتھ ایک ایسا معنی چپکا سکتا ہے، جس کی تصویر وہ اپنے ذہن میں بنائے گا۔ اس نے سوچنا شروع کیا، وہ تصویر کیا ہونی چاہیے؟ کافی دیر وہ خالی ذہن بیٹھا رہا۔ پھر کچھ سرمئی رنگ کے، آدھے ادھورے سے خاکے نمودار ہونے لگے۔ اس نے کہا کیا مصیبت ہے یہ؟ اس کے ساتھ ہی اس کے منطقی ذہن کی جگہ فیصلہ صادر کرنے والا قاضیانہ ذہن کام کرنے لگا۔ جرم کہیں نظر نہیں آتا۔ نظر آتا تو گواہوں کی ضرورت کیا تھی؟ وہ تو بس چھلاوے کی طرح اچانک رونما ہوتا ہے، اور پیچھے کہانیاں، شہادتیں، بچے کھچے نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ انھیں جوڑ کر جرم کی شکل بنانے کے لیے میرے جیسے مورکھ ہوتے ہیں۔ سارا جھگڑا ہی بچے کھچے ٹکڑوں سے شکل بنانے کا ہوتا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا ذہن سرمئی خاکے بنا کر ٹھیک کام کر رہا تھا۔ اس نے اس خاکے کو ایک تصویر میں بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ وہ اس سلسلے میں خاصا اناڑی ہے۔ اس نے آج تک اتنی دیر کے لیے غور کیا ہی نہیں تھا، اور لفظوں پر غور کی عادت تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ وہ لغت بھی بس طالب علمی کے زمانے میں استعمال کیا کرتا تھا، جو اس کے تذبذب اور بے یقینی کو یقین میں بدل دیا کرتی تھی۔ ایک مدت سے اسے لغت کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ حاکم شہر کا حکم تھا کہ کسی مقدمے کے فیصلے میں تاخیر نہ کرے۔ تاخیر سزا نہ دینے یا صحیح آدمی کو غلط سزا دینے یا غلط آدمی کی سزا مؤخر کرنے کا حربہ ہوتی ہے۔

اس نے ادھ جلی ہڈیوں، اڑتی راکھ، گرے ٹوٹے مکانوں، خون آلود کپڑوں، تیز دھار خون آلود نیزوں، سنگینوں، کٹی گردنوں، قہقہہ لگاتے، دانت نکوستے چہروں اور پتھر کی طرح خاموش آنکھوں کی کٹی پھٹی شبیہوں کی مدد سے تصویر بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے ہی اس تصویر کے کچھ خدوخال واضح ہونے لگے، اسے لگا کہ وہ پہاڑ بھک سے اڑ گیا ہے، اور اس کے روئی کے گالوں جیسے ٹکڑے اس کی طرف یلغار کرنے لگے ہیں۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے لفظ اودھم مچانے لگے۔ پاپ، خطا، تقصیر، قصور، اوگن، ادھرم، معصیت، اصول، قدر، اچھائی، برائی، شر، خیر، آفت، آزار، بیداد، تعدی، جور، بربریت۔ نیز زیادتی، زنا، آبرو ریزی، عصمت دری، حرام کاری، بدفعلی، بدکاری، بدچلنی، اوباشی، فحاشی، بے حیائی، فسق و فجور، شہوت پرستی۔ حیف! ساری محنت اکارت گئی! وہ جس پہاڑ کو ایک لفظ

Scanned with CamScanner

"جرم" کے اندر داخل کرنے کی سعی کر رہا تھا، اس نے تو اسے پٹیں کے رکھ دیا۔ اس نے سامنے کاغذ پر دیکھا، وہاں اتنے لفظ ہجوم کیے ہوئے تھے کہ اس نے رب اللسان سے پناہ مانگی۔ ضرور مجھے شیطان بہکا رہا ہے۔ میں سوچنا کچھ چاہتا ہوں، سوچنے کچھ اور لگتا ہوں۔ شیطان آدمی کے ارادے کو خاموشی سے بدلنے کے سوا کرتا ہی کیا ہے؟ مجھے آج یقین ہو گیا کہ سارے شیطانی کھیل، اصل میں لفظی کھیل ہیں۔ مجھے شاعری سے نفرت اسی لیے ہے کہ اس کے لفظوں میں شیطان سمایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ دربار میں کسی نے یہ شعر پڑھا:

رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہد شیخ
اے بے وقوف جائے عبادت گناہ کر

اسے حیرت ہوئی تھی کہ بھرے دربار میں کسی نے اس بات کی پروا نہ کی تھی کہ شعر میں عبادت کی جگہ گناہ کی باقاعدہ ترغیب دی گئی تھی۔ جب تک شاعری ہے، دنیا سے گناہ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اسی محفل میں ایک اور شعر بھی پڑھا گیا تھا۔ اسے سن کر تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ دربار کے آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، توبہ استغفار کرتے ہوئے، اٹھ آیا تھا۔

کب مزہ ہے نماز صبح میں وہ
جو صبوحی کے ہے گناہ کے بیچ

وہ آج بھی ان شعروں کو سوچ کر توبہ توبہ کر رہا تھا۔ میں حاکم شہر سے درخواست کروں گا کہ نئے حکم نامے میں شاعری پر مکمل پابندی عائد کرے۔ یہاں تک کہ مذہبی شاعری پر بھی۔ شاعری جہاں بھی ہوگی، وہاں لفظوں سے کھیلے گی، ایک لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے گی، گناہ جیسے لفظ کو کچھ سے کچھ معنی دے دے گی، گناہ کو حسین قابل تقلید و تحسین بنا کر پیش کر دے گی، دلوں سے ہیبت کو دور کر دے گی۔ دیوتاؤں اور خداؤں کی تمجید میں بھی وہ باتیں کہہ جائے گی جو جرم ہوں گی.... جرم... یہ بھی ہے کہ جو تم سوچنا چاہو، اس کی جگہ کچھ اور سوچو، اور اس کا جواز نہ ہو تمھارے پاس.... جو کچھ بھی، کسی بھی طرح بھٹکاتا ہے، وہ جرم ہے.... لیکن وہ ہے کیا؟ اس کی ایک واضح صورت کیا ہے؟ جسے 'سب' میرا مطلب ہے، حاکم، وزیر مشیر، میں .... جرم کہیں، اور باقی سب، ہاں باقی سب بھی جرم سمجھیں، سدا کے لیے یا

Scanned with CamScanner

جب تک حاکم شہر پسند فرمائے.... گناہ، پاپ، قانون شکنی.... ایک بار پھر اس کے ذہن میں وہی لفظ ہجوم کرنے لگے....

ایک واقعے سے متعلق اتنے الفاظ؟ یہ سب کہاں سے آئے؟ یہ پہاڑ کیسے بنا جس کے صرف کچھ ٹکڑے اس نے ابھی دیکھے ہیں؟ واقعہ پیچھے جاتا جا رہا ہے، اور لفظ ہجوم در ہجوم اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں، اور یہ سارا ہجوم اس کی طرف بڑھ رہا ہے.... نہیں واقعہ پیچھے نہیں جا رہا، وہ ہر لفظ میں سماتا جا رہا ہے.... ہر لفظ کے ساتھ اس کی نئی شکل صورت بنتی جا رہی ہے، وہ زیادہ بڑا ہوتا جا رہا ہے، ایک جگہ سے نکل کر ہر شخص کے منھ سے ادا ہونے والے لفظ میں داخل ہو رہا ہے، اور اس لفظ میں کوئی برق سی بھرتا جا رہا ہے.... یہ برق جلا ڈالے گی.... وہ بری طرح گھبرا گیا۔ ایسا تو آج تک نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے حاکم شہر کی مشکل بھی سمجھ میں آئی، جو واقعات سے نہیں، ان پر ہونے والی بحثوں سے ڈرتا تھا اور اسی لیے اس نے ہر واقعے کے لیے ایک لفظ مقرر کرنے کی ذمہ داری اسے سونپی۔ لفظ کے ذریعے واقعے کو قابو میں کرنا آگ سے کھیلنا ہے۔ اس نے سوچا۔

اس نے اگلے دن ہر حال میں فیصلہ سنانا تھا۔

اب اس نے ایک عملی آدمی کی طرح سوچنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے عمومی کے بجائے خصوصی مسئلے پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کا عزم کیا۔ (اس نے اس خیال کو کہیں لاشعور میں دبا دیا کہ ہر خصوصی مسئلہ عمومی بننے کا میلان رکھتا ہے)۔ کیا لڑکی کی خون آلود شلوار اور اس کے بدن پر خراشیں بتانے کے لیے کافی نہیں تھیں کہ سپاہی کا عمل کیا تھا، اور اس کی سزا ابھی مقرر ہے؟ یہ سیدھا سادہ جرم ہے۔ لیکن یہ اثبات کرتے ہی اسے سپاہی کی یہ بات یاد آئی کہ پہلے جرم کا ایک معنی طے کیجیے۔ اگر آبروریزی جرم ہے تو قتل کیا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ پھر اچانک یاد آیا کہ قتل کے لفظ کا استعمال تو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں حاکم شہر کے حکم کی جارحیت کو شدت سے محسوس کیا۔ دل میں مزاحمت بھی پیدا ہوئی، مگر اسے جلد کسی فیصلے پر پہنچنا تھا۔ اس نے عملی آدمی کی انگلی پکڑے رکھی۔ اس نے باری

Scanned with CamScanner

باری ایک ایک لفظ پر غور کرنا شروع کیا۔ زنا، آبرو ریزی، عصمت دری، حرام کاری......تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ وہ ایک لفظ پر غور کرتا ہے، اس کا پہلے ایک مطلب ذہن میں آتا ہے (جو ہمیشہ ایک لفظ ہوتا ہے)، پھر دوسرا، پھر تیسرا، اور ہر مطلب کے ساتھ کوئی دوسرا لفظ موجود ہوتا ہے، جس کے اپنے مطالب کا سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کی کوئی حد ہی نہیں۔ اسے لگا جس وقت سے اس نے ایک ٹھوس حقیقت کے لیے واحد لفظ پر غور شروع کیا ہے تو اس کے پاؤں کسی پختہ زمین پر نہیں رہے، وہ کسی دلدلی زمین میں دھنستے جا رہے ہیں۔ اس نے عملی آدمی کی انگلی پکڑے پکڑے ایک خاص لفظ کو پکڑا، جیسے گرداب میں گھرا شخص کسی تختے کو پکڑتا ہے۔ پہلے اس نے گناہ لفظ کو سوچا...جرم انسانی...قانونی ہے...گناہ مذہبی ہے...لیکن سب مذاہب میں گناہ....نہیں نہیں مجھے 'سب' لفظ کے استبداد سے بچنا ہے.....جو گناہ ہے، وہ جرم بھی ہے؟...یہ میں کس سے سوال کر رہا ہوں...مجھے حاکم شہر نے اختیار دیا ہے...لیکن کیا میں انسانوں سے ماورا طاقتوں کے فیصلوں میں دخل....وہ ڈر گیا....زنا کیا ہے؟ جرم یا گناہ، یا دونوں؟....لیکن زنا ہے کیا، ایک عمل کے طور پر؟ جس وقت یہ عمل ہوتا ہے، اس وقت یہ جرم یا گناہ یا دونوں ہے، یا بعد میں؟ جو اس میں شریک ہوتے ہیں، یا شریک ہوتا ہے، اسے کتنا اختیار ہے، اس کے معنی کا؟...بغیر اختیار کے سزا....جوں ہی اس نے اس پر غور شروع کیا، اسے لگا جیسے وہ ایک ایسے منطقے میں داخل ہو رہا ہے جو ممنوعہ ہے، مگر اس میں عجب کشش بھی ہے۔ یہ عجیب طلسماتی لفظ ہے، جس کا معنی بعد میں معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے خاص طرح کا، مگر الجھا ہوا احساس پہلے محسوس ہوتا ہے۔ نہیں احساس نہیں، ذائقہ کہنا چاہیے۔ کیا یہ ذائقہ سب کو محسوس ہوتا ہے؟ کیا اس ذائقے کے سبب ہی سپاہی نے لڑکی کو...لڑکی نے سپاہی کو.....؟ کیا یہ لفظ ہی اس عمل کا باعث ہے، یا سارا عمل اس لفظ میں سمٹ آیا ہے؟ زنا، مرد کے لیے ہے یا عورت کے لیے، یا دونوں کے لیے، یا صرف ہم جیسے قاضیوں کے لیے ہے، یا کسی دوسری طاقت نے اس کا فیصلہ کیا، اگر اس نے فیصلہ کیا تو اس کی ذمہ داری ہم جیسوں کے سپرد کیسے ہوگئی؟ اتنا نیا نیا، آدمی کے حواس کو مختل کر دینے والا، ایک حشر اٹھا دینے والا کثیر طرفہ عمل ایک لفظ میں کیسے سما سکتا ہے؟ عین اسی لمحے اس نے حاکم کے حکم نامے کی جارحیت کو پھر محسوس کیا۔ قاضی کے لیے یہ بالکل نئی اور ممنوعہ بات ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ قاضی کسی

Scanned with CamScanner

عمل پر فیصلہ اور حکم دیتا ہے، اس میں خود کو شریک ہونے سے باز رکھتا ہے۔ اس نے خود کو یاد دلایا، لیکن وہ تمام الفاظ اسے کسی نہ کسی منوعہ علاقے میں کھینچ لے جاتے تھے۔ اس نے کوئی ایسا لفظ تلاش کرنے کی کوشش کی، جس میں کوئی ٹھوس حقیقت مجسم ہوگئی ہو۔ اس نے ظلم، آبروریزی، زیادتی، قانون شکنی جیسے لفظوں پر ٹھہر ٹھہر کر غور کیا، مگر ہر لفظ کے ساتھ کوئی نہ کوئی احساس.... نفرت، ناپسندیدگی، غصہ، رنج، کراہت، گریز.... اسی طرح وابستہ تھا، جیسے آگ سے تپش، پانی سے بہاؤ کی صفت وابستہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب پہلی مرتبہ اس کے علم میں آرہا تھا.....

اسے یاد آیا، وہ اب تک لفظوں کو سکوں کی طرح استعمال کرتا آیا تھا، جن کی قیمت ان پر لکھی ہوتی ہے، اور یہ قیمت سب لوگ مل جل کر طے کرتے تھے۔ اسے کوئی ایسا شخص یاد نہیں تھا، جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ لفظ کے کسی سکے کی قیمت اس نے طے کی تھی، اور کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملا جو یہ کہتا ہو کہ کسی لفظ کی قیمت اس کی استطاعت سے زیادہ ہے۔ اس نے یہ بھی یاد کیا کہ شہر میں واحد چیز زبان ہے، جس پر کسی ایک کا اختیار نہیں، مگر سب کا اختیار ہے۔ یہ ایسا سکہ ہے جو ہر شخص کی جیب میں ہے، اور وہ شخص جب اس کو استعمال کرتا ہے تو اس کی قیمت کے مقرر کرنے کے عمل میں شریک ہوتا ہے۔ اس پر یہ بھی کھلا کہ ہمیشہ سے لفظوں کے ایک سے زیادہ معنی رہے ہیں، مگر لوگ ہر لفظ کو، ایک موقع پر ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں، باقی معانی کو وہ خود ہی مکھیوں کی طرح اڑاتے رہتے ہیں، اور وہ مکھیاں کہیں نہیں جاتیں، وہ اسی لفظ کے گرد بھنبھناتی رہتی ہیں۔ مکھیوں کو اڑانے کا کام اسے سونپ دیا گیا ہے، مگر مکھیاں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ مکھیاں اس قدر زیادہ ہیں، اور اس کے سوچتے چلے جانے سے اس تیزی سے بڑھ رہی ہیں کہ وہ اس کا سانس بند کردیں گی۔ اس نے مکھیوں کی جارحیت کے مقابلے میں خود کو بے بس محسوس کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس نے جس پہاڑ کی چوٹی پر انگارے دیکھے ہیں، وہ انھی مکھیوں سے بنا تھا۔ اس نے خشوع وخضوع سے اس انکشاف کو دل پر رقم ہونے دیا کہ حاکم شہران مکھیوں کو شاہی سکے میں بدلنا چاہتا ہے، اور انھیں اپنی جیب میں رکھنا چاہتا ہے، اور راشن کی طرح لوگوں میں اپنی منشا کے مطابق بانٹنا چاہتا ہے، کیا یہ ممکن ہے... وہ بادشاہ ہی سہی، کیا وہ لفظ کو شاہی سکہ بنا سکے گا....؟؟....

Scanned with CamScanner

اس نے قلم اٹھایا اور فیصلہ لکھنا شروع کیا۔

حاکم کے سپاہی کو دس سال قید کی سزا ملی۔ فیصلے میں لفظ جرم کی جگہ ظلم یعنی اپنی حد سے بڑھا ہوا اور دوسرے کی شخصی حد میں مداخلت اور اسے پامال کرنے والا عمل لکھا ہوا تھا۔ لیکن اگلے دن قاضی کو جلاوطن کر دیا گیا، اور ایک نیا قاضی مقرر کر دیا گیا جس کے اختیارات میں یہ بات بھی شامل کر دی گئی کہ وہ چاہے تو بغیر وجہ بتائے کسی بھی عمل کی کوئی بھی سزا دے سکتا ہے۔

کچھ خاص لوگوں تک اڑتی اڑتی خبر پہنچی کہ قاضی نے مقدمے کا فیصلہ لکھنے کے ساتھ ساتھ حاکم شہر کو لکھ بھیجا کہ اسے بتایا جائے کہ اسے لوگ حاکم، آقا، حکمران، بادشاہ، سلطان، شہنشاہ، ظل الٰہی، ظل سبحانی، جہاں پناہ جیسے کئی لفظوں سے پکارتے ہیں۔ اسے کس ایک لفظ سے پکارا جائے؟ نیز لوگوں کو رعایا، مخلوق، محکوم، غلام، فدویان میں سے کس لفظ سے آئندہ لکھا اور پکارا جائے۔ قاضی نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسے راہنمائی دی جائے کہ حاکم و محکوم کے لیے ایک ایک لفظ کے مقرر ہونے کے بعد کیا محکوموں کو آدمی کی نوع میں شمار کیا جائے گا یا نہیں۔

■•◆•◆•◆•■

Scanned with CamScanner

حکایاتِ جدید و مابعد جدید

Scanned with CamScanner

شکر اس کا جس نے ہمیں آدمی یا سور نہیں بنایا

چھت کی جانب جاتی ہوئی چیونٹیوں نے دیکھا کہ اس کمرے میں مدت بعد آدمیوں کی آواز سنائی دی ہے۔ ان کے ننھے قدم رک گئے۔ کچھ دیر تو انھیں سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ کیا کریں۔ ان میں سے چند ایک بوڑھی چیونٹیاں ایسی تھیں، جنھیں وہ زمانہ کچھ کچھ یاد تھا، جب اسی کمرے میں ہر شام ایک شخص کبھی اکیلا، اور کبھی دوستوں کے ساتھ شراب پیتا تھا، اور بھنا ہوا گوشت کھاتا تھا۔ بھنے ہوئے گوشت کے کچھ ذرے ادھر ادھر بکھر جاتے تھے، تو ان کی اشتہا ان چیونٹیوں کو اپنی جانب کھینچ لے جاتی۔ وہ بے خودسی ہو کر ان پر ٹوٹ پڑتیں۔ بھنے گوشت کی ریخوں سے کہیں کہیں ایک عجب بو انھیں محسوس ہوتی، جو کافی ناگوار ہوتی۔ یہ آدمی بھی عجب مخلوق ہے۔ یہ شکم سے نہیں دماغ سے کھاتا ہے۔ وہ سوچتیں۔ پھر اچانک یہ کمرہ خالی ہو گیا۔ چیونٹیاں مہینے، سال کی مدد سے وقت کا حساب نہیں رکھتیں، وہ صرف روشنی اور اندھیرے کو پہچانتی ہیں۔ اگلے دن بھول جاتی ہیں کہ کل کیا ہوا تھا۔ مگر یہ سب چیونٹیوں کو یاد تھا کہ اس کمرے کے صرف جنوبی روشن دان سے کچھ دیر کے لیے روشنی آتی تھی، ورنہ اندھیرا ہی رہتا۔ ان بوڑھی چیونٹیوں نے اس کمرے کو کچھ عرصہ پہلے دوبارہ روشن دیکھا، اور وہی ناگوار بو۔ ایک نئی، عجب بات اور بھی تھی۔ ایک نئی مخلوق وہاں نظر آئی۔ ایک بڑی بوڑھی چیونٹی نے سب کی حیرت کو محسوس کر کے کہا کہ یہ سور ہیں، جنھوں نے کچھ عرصہ پہلے آدمیوں کو یہاں سے نکال کر اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ اس پر باقی چیونٹیاں رقص کرنے لگیں۔ ٹھہرو، ابھی آگے کا قصہ بھی سنو، جسے سن کر تم رقص کرنا بھول جاؤ گی۔ سور، آدمیوں کو نکال کر خود آدمی بن گئے ہیں۔ چادر والے بستروں پر سوتے ہیں، سیب اور گوشت

Scanned with CamScanner

کھاتے ہیں، اور اب شراب بھی پینے لگے ہیں، اور آدمیوں ہی کی طرح وقت بے وقت جنسی عمل کرنے لگے ہیں، اور جہاں بیٹھتے ہیں، صرف دو طرح کی باتیں کرتے ہیں، جنس اور سیاست کی۔ اور انھی باتوں سے ایک بڑی سلطنت چلا رہے ہیں۔

آج انھوں نے آدمیوں کو بلایا ہے۔ آدمیوں کو بھی عجب نہیں لگا۔ دیکھو، دونوں مل کر ایک ہی جگہ شراب پی رہے ہیں، بھنا ہوا گوشت کھا رہے ہیں، اور ایک دوسرے سے فحش باتیں کر رہے ہیں، اور ایک دوسرے کو اپنے اپنے رموز مملکت بتا رہے ہیں۔

ابھی یہ بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ سب نے ایک انوکھی بات دیکھی۔ ان کے چہرے ایک دوسرے سے بدل گئے تھے۔ ٹانگوں سے آدمی اور چہرے سے سور، اور چہرے سے آدمی اور ٹانگوں سے سور۔ سب چیونٹیاں اس بوڑھی چیونٹی کے گرد جمع ہو گئیں۔

میرے لیے بھی یہ ایک معما ہے۔ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں، مگر میرا مغز بڑا نہیں۔ لیکن میں نے سن رکھا ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، اس پر تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی جائے تو پھر خود بہ خود سمجھ آنے لگتی ہے۔

سب خاموش ہو گئیں۔ سب نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد سب نے اس بوڑھی چیونٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک چپ تھی۔ وہ سب ڈر گئیں۔ انھوں نے کبھی اس طرح کا نہ تو نیا منظر دیکھا تھا، نہ کبھی سوچا تھا۔ اکثر تو بے زار ہو کر چل پڑیں۔ انھیں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ دو ایک رک گئیں۔ انھوں نے تب تک انتظار کیا، جب تک بوڑھی چیونٹی خود نہیں بولی۔

ہاں، مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہا ہے۔ ان سب نے چہرے آپس میں نہیں بدلے۔ آدمیوں کے پاس کئی چہرے ہیں۔ وہ سور، بھیڑیے، کتے، ہاتھی، شیطان، دیوتا، سب کے چہرے رکھتا ہے۔ پریشانی صرف یہ ہے کہ سوروں کے پاس کہاں سے آدمی کا چہرہ آ گیا؟

جب انھوں نے آدمیوں کی طرح رہنا بسنا شروع کیا تو اپنا چہرہ بھی آدمیوں کی طرح بنا لیا۔ ایک چیونٹی نے رائے دی۔

ہونہہ، ہو سکتا ہے۔ جس کے نقش قدم پر چلا جائے، اس کا چہرہ اور شناخت دونوں مل جاتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ بوڑھی چیونٹی بولی۔

کیا ہمیں بھی آدمی کا چہرہ مل سکتا ہے؟ ایک نوعمر چیونٹی نے جوش سے سوال کیا۔

ہمارے پاس اتنی چھوٹی آنکھیں ہیں کہ ہم آدمی کا پورا چہرہ نہیں دیکھ پاتیں، اور پھر ہمیں کیا معلوم کہ کون سا چہرہ آدمی کا اصلی چہرہ ہے؟ جس لمحے ہم اس کے چہرے کی خواہش کریں، اگر اس وقت اس نے بھیڑیے کا چہرہ چڑھا رکھا ہو، یا ہاتھی کا تو پھر؟؟

ہاں اتنی ننھی ٹانگوں پر اتنا بڑا منھ، توبہ، توبہ۔ ہمیں اپنا چہرہ ہی ٹھیک ہے۔ ویسے ہمارا چہرہ ہے کیسا؟ وہی نوعمر چیونٹی بولی۔

کم از کم نہ آدمی جیسا ہے، نہ سور جیسا۔ بوڑھی چیونٹی نے خوش ہو کر کہا، جیسے اس نے کوئی بہت بڑی بات دریافت کر لی ہو۔

شراب اور بھنے ہوئے گوشت کا سیاست اور جنس سے کوئی تعلق ضرور ہے۔ نوعمر چیونٹی پھر بولی۔

لگتا ہے، تم میں بھی آدمی کا دماغ سما گیا ہے۔ بوڑھی چیونٹی بولی۔ تم بھنے ہوئے گوشت سے زیادہ، اس کے ذکر میں لذت محسوس کر رہی ہو۔ ہاں، اب بات سمجھ میں آئی، آدمی کو دماغ کی لذت زیادہ پسند ہے۔ جنس اور سیاست کے بارے میں سوچنے اور باتیں کرنے میں زیادہ لذت ہے۔ ان کی کوئی کہانی، ان دو باتوں کے ذکر کے بغیر نہیں ہوتی۔

ایک بات تم بھول رہی ہو۔ تم نے اس بوڑھے کو نہیں دیکھا جو بار بار سینے کی طرف ہاتھ لے جا رہا ہے۔ نوعمر چیونٹی نے اشارہ کیا۔

اسے کیا کہتے ہیں، ہاں، یاد آیا مذہب۔ جب یہ تھک جاتے ہیں، یا بوڑھے ہو جاتے ہیں، یا سیر ہو جاتے ہیں تو روتے ہیں، نادم ہوتے ہیں، معافی مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایڑیاں اور ماتھا بھی رگڑتے ہیں۔ خدا، خدا کہتے ہیں۔

کیا یہ بھی دماغ کی لذت ہے؟ نوعمر چیونٹی نے سوال کیا۔

مجھے ان کی ساری باتیں تھوڑی معلوم ہیں، پر میں اپنے تجربے سے کہہ سکتی ہوں کہ آدمی نے

Scanned with CamScanner

اصل لذت پر دماغ کی لذت کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اور ان کا دماغ ہماری قطار کی مانند ہے۔ چلتا ہی رہتا ہے۔ تم دیکھنا، ابھی انھوں نے سور کا چہرہ پہنا ہے، کچھ دیر میں یہ بھیڑیے بنیں گے، پھر خوں خوار کتوں کی مانند ایک دوسرے پر غرائیں گے، پھر بدمست ہاتھی بن جائیں گے، پھر سوروں کی طرح اپنی اور دوسروں کی عورتوں کو بھنبھوڑ ڈالیں گے، پھر بے سدھ ہو کر گدھے کی طرح خراٹے لیں گے، اور پھر اگلے دن پارسا نظر آئیں گے۔ افسوس سوروں کا ہے، جو نہ پورے آدمی بن سکیں گے، نہ پورے سور باقی رہیں گے۔

اس سے پہلے کہ ہم بھی آدمیوں کی طرح دماغ کی لذت کا شکار ہو کر بس باتیں کرتی رہیں، آؤ ان کی بچی ہوئی خوراک سے اپنا پیٹ بھریں، اور اس کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں آدمی یا سور نہیں بنایا۔

◎ ◎

کس کا نام؟

وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے ایک شخص ایک پیالہ لے کر پہنچا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔ پیالہ پیش کرنے والے نے کہا: یہ پانی مرتے آدمی کو بچا سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے گھونٹ کے بعد مریض کسی شخص کا نام لے۔ جس کا نام لیا جائے گا اس کے گھر میں ماتم اور تمھارے گھر میں جشن شروع ہو جائے گا۔

یہ بولنے سے قاصر ہے۔ اس کا بھائی بولا۔

پہلا گھونٹ پیے گا تو بولنے بھی لگے گا۔ پیالہ لانے والے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس کا بھائی چپ ہو گیا۔

ڈر گئے ہو؟ کیا تم نے اس کی جائیداد پر قبضہ کر رکھا ہے؟ یا اس کی جوان بیوی پر نظر رکھتے ہو؟

میں واقعی ڈر گیا ہوں، مگر ڈرنے کی وجہ وہ نہیں جو تم نے بیان کی۔ ہمارا باپ مرا تو بھائی جان کی عمر پندرہ اور میری صرف دو سال تھی۔ اس نے مجھے باپ کی طرح پالا ہے۔ اگر اس نے پہلا گھونٹ

Scanned with CamScanner

پیا، اور بولنے لگا، اور..... سب سے پہلے اپنے مسیحا کو اس نے پکارا..... تمھارا نام لے دیا تو؟

یہ میرا نام نہیں جانتا۔ میرا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ جانتے ہو، کوئی شخص مرتے وقت کیا دیکھ اور سوچ رہا ہوتا ہے؟

یہ تو مرنے والا ہی بتا سکتا ہے۔ چھوٹا بھائی منمنایا۔

اس سوال کا تعلق مرنے والے سے نہیں، اس کے بچانے والوں سے ہے۔

میں سمجھا نہیں۔

اگر پاس کھڑے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ مرنے والا کیا دیکھ، سوچ رہا ہے تو وہ اس کو بچانے والے نہیں، اس کی موت کی خواہش، یا انتظار کرنے والے ہوتے ہیں۔ زندہ آدمی دھوکا دے سکتا ہے ،مرنے والا نہیں۔ مرنے والے کے سرہانے کھڑے ہوئے بھی اسے دھوکا دینے سے باز نہیں آتے۔ تمھیں واقعی یہ معلوم نہیں کہ تمھارا بھائی اس وقت کیا سوچ رہا ہے؟

شاید یہ سوچ رہا ہے کہ اگر میں بچ گیا تو مجھ سے بڑی بہن کی شادی جلد کرے گا، اور اپنے بڑے بیٹے کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجے گا۔ چھوٹے بھائی نے خجالت کے احساس سے کہا۔

یہ تو تمھارے ڈر اور بزدلی کا اظہار ہے۔ تم گھبرا رہے ہو کہ اگر یہ مر گیا تو تمھیں بہن اور بھتیجے کی ذمہ داری اٹھانا پڑے گی۔ مرنے والا کچھ نہیں سوچتا۔ صرف دیکھتا ہے۔

تمھیں کیسے پتا؟

میں نے مرنے والوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ آدمی کے ہاتھ پاؤں سے لے کر سر کے بال تک سب سوچتے ہیں، صرف آنکھیں نہیں سوچتیں۔ وہ ایک ہی کام کرتی ہیں، اس لیے کبھی غلطی نہیں کرتیں۔ کیا میں پیالہ اس کے منھ سے لگا دوں؟ پیالہ لانے والے نے کہا۔

ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے جادوئی پانی تو بنالیا، اس کے ساتھ انوکھی شرط کیوں رکھی؟

یہ شرط میں نے نہیں رکھی۔ میں نے محض دریافت کی ہے۔ تم بھی اگر چل پھر کر دیکھو تو تم پر کھلے کہ موت اور زندگی ایک چکر کی مانند ہیں۔ تم پانی پیتے ہو تو کیا ہوتا ہے؟ پانی کو تم مردہ سمجھتے ہو؟ مرتے شخص کے لیے پانی کا اثر اور مطلب وہ نہیں، جو ایک زندہ پیاسے شخص کے لیے ہے۔ خیر یہ

Scanned with CamScanner

باتیں اس وقت تمھیں سمجھ نہیں آئیں گی۔

بھائی پتا نہیں کس کا نام لیں؟ بھائی کو کن لوگوں نے تکلیف پہنچائی۔ ہاں یاد آیا۔ چھوٹے چچا نے ابا کے مرنے کے بعد ان کو ایک بار گالی دی تھی۔ بھائی ساری رات سو نہیں سکے تھے۔ بھائی نے سیدوں کو ووٹ نہیں دیا تھا تو انھوں نے ایک بار بیچ سڑک کے بھائی کو روک کر برا بھلا کہا تھا تو بھائی نے بددعا دی تھی تمھیں وہی خدا پوچھے، جس نے تمھیں سید بنایا، اور تم فرعون بن گئے۔ اور ہاں، ایک بار میں نے بھائی سے بدتمیزی کی تھی، جب انھوں نے رات دیر سے گھر آنے پر مجھے ڈانٹا تھا۔ مگر میں نے اگلی صبح ہی معافی مانگ لی تھی۔ کیا مرتے وقت بھی آدمی اپنے دشمنوں کو یاد رکھتا ہے، یا دوستوں کو؟ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کرنے کے بارے میں سوچتا ہے، یا بدلہ لینے کا؟ بدلہ تو زندگی سے بھرپور شخص لینا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے مرتے وقت کوئی شخص صرف اپنی زیادتیاں یاد کرتا ہو، اور خدا سے معافی طلب کرتا ہو؟ جسے اپنی زیادتیاں یاد آئیں، وہ دشمنوں کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے؟ موت سے بڑھ کر بھی کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟ اتنے بڑے دشمن کے آگے چھوٹے موٹے دشمن کہاں ٹھہر سکتے ہیں؟ آدمی کے دل پر کون سے نقش ایسے ہیں جو موت کی آہٹ پا کر بھی نہ مٹتے ہوں؟

تم ڈر رہے ہو۔ میں نے تمھیں کہا ہے کہ مرتے وقت آدمی صرف دیکھتا ہے۔ اور دیکھنے کا مطلب سمجھتے ہو؟

یہی کہ وہ آس پاس کے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ ان کے چہروں کی فکرمندی دیکھ کر پریشان ہوتا ہے۔

نہیں۔ لگتا ہے تم نے کبھی کچھ 'دیکھا' نہیں، صرف سوچتے ہو۔ سوچنے والا پریشان رہتا ہے، اور دیکھنے والا خاموش۔ تم پریشان ہو، اور تمھارا بھائی خاموش ہے۔

ابھی تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرا بھائی کیا سوچ رہا ہے؟

پوچھا تھا، پھر یہ تمھیں بتایا بھی کہ صرف آنکھیں نہیں سوچتیں۔ مرتے وقت آدمی کا ذہن آنکھ

Scanned with CamScanner

بن جاتا ہے، اور بدن ذہن بن جاتا ہے، اور وہ سب دیکھتا ہے جو تھا، جو ہے، اور جو ہوگا۔ یہ سب دیکھنے کے بعد، کیا دیکھنے کو باقی رہ جاتا ہے؟

میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔

تمھارے پلے سب پڑے گا، کبھی۔

وہ کانپ اٹھا۔

اس وقت کیا سوچ رہے ہو؟

میں..... میں ..... بس یہ سوچ رہا ہوں کہ بھائی کس تکلیف میں ہیں..... ان کی آنکھیں بجھی ہوئی ہیں... میں سوچ رہا ہوں کہ بھائی کس کا نام لیں گے؟ بھائی تو دیالو ہیں، پر سنا ہے موت کا فرشتہ آدمی کو دو لمحوں کی مہلت دیتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ اس کی آخری خواہش؟ یہ بھی سنا ہے کہ موت کے فرشتے کی صورت دیکھ کر آدمی خواہش نہیں کرتا، کوئی بات بے ساختہ کہتا ہے۔ بھائی بتایا کرتے تھے، جب ابا کی موت ہوئی تھی تو ان کے منھ سے جو آخری لفظ ادا ہوا تھا، اس کے بارے میں سب کی رائے الگ الگ تھی۔ اماں کہا کرتی تھیں کہ انھوں نے کلمہ پڑھنے کے بعد سب بچوں کے نام لیے تھے، پر بھائی کہتے تھے، انھوں نے کسی ایسی زبان کا لفظ بولا تھا، جسے انھوں نے کئی لوگوں سے پوچھا، کتابوں میں دیکھا، پر انھیں اس کا مطلب نہیں ملا۔ شاید انھوں نے موت کے فرشتے کی کسی بات کا جواب دیا ہوگا، جس کی زبان پنجابی یقیناً نہیں ہوگی.... فرشتے کون سی زبان بولتے ہیں؟ بھائی فرشتے سے کم تھوڑی ہیں۔ پر موت کا فرشتہ... فرشتہ کیسے ہوسکتا ہے؟.... ہوسکتا ہے، بھائی سب کو معاف کر دیں۔

تم مانتے کیوں نہیں ہو؟ تم ڈر رہے ہو کہ کہیں تمھارا نام نہ لے دیں۔ تمھیں یہ ڈر نہیں کہ اگر دیر ہوگئی تو تمھارے بھائی موت کے منھ میں جاسکتے ہیں؟

جی۔ جی۔ آپ جلدی سے۔ نہیں.... آپ مجھے دیں۔ میں ان کے منھ سے اللہ کا نام لے کر پیالہ لگاتا ہوں۔

اس نے پہلا گھونٹ پیا۔ آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔

چھوٹے بھائی پر کپکپی طاری تھی۔ کاش اس کے کانوں میں کوئی روئی ڈال دے۔ اس نے

Scanned with CamScanner

شدت سے خواہش کی۔

اس کے دوسرے گھونٹ پینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے اپنا نام لیا تھا۔

◎ ◎

گھسا ہوا جوتا

مجھ سے پہلے دو لوگ وہاں گئے۔ دونوں اپنا اپنا اسم لے کر لوٹے۔ اور بھی گئے ہوں گے، مگر میرے جاننے والے بس یہی دو تھے۔ جس طرح ہر آدمی کا ماتھا، اس کی آنکھ کا رنگ، اور اس کے ہاتھوں کے انگوٹھے الگ الگ ہیں، اسی طرح ہر شخص کا ایک اسم بھی ہے، جو اسے ماں باپ کی طرف سے دیے گئے نام سے الگ ہے۔ یہاں تک مجھے یہ بات سمجھ آئی۔ البتہ اس میں ایک بات کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے: یہ کہ ہر آدمی کے دانت بھی الگ ہیں۔ چوں کہ وہ چھپے رہتے ہیں، اس لیے اکثر معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ کیسے ہیں؟ پر اتنی بات تو ہر وہ شخص جانتا ہے، جس نے آدمی کا منھ کھلا ہوا اور چلتا دیکھا ہے کہ وہ چرندوں اور درندوں کے دانتوں سے بالکل الگ ہیں۔

یہ بات میرے پلے نہیں پڑی کہ کسی کے مخصوص اسم کا فیصلہ کوئی دوسرا کیسے کر سکتا ہے؟ میری ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میں اپنے اسم کو اپنے ماتھے، اپنی آنکھ کے رنگ اور اپنے انگوٹھے کی مانند سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ سب تو مجھ پر تھوپ دیے گئے۔ مجھ میں جو تھوڑی بہت ہمت تھی، وہ انھی کا بوجھ اٹھاتے صرف ہو گئی۔ ماتھے کا بوجھ تو سب سے بھاری ہے، اس قدر کہ میری کھوپڑی اس کی تاب اکثر نہیں لا پاتی۔ دونوں میں جھگڑا بھی رہتا ہے۔ انگوٹھے سے بھی میں کافی پریشان رہتا ہوں۔ یہ ظالم لحاظ ہی نہیں کرتا، کہیں بھی کسی بھی وقت، میری چھوٹی موٹی اصل سر بازار آشکار کر دیتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ اسے جیب ہی میں ٹھونسے رکھوں۔ البتہ آنکھوں سے پریشانی کم ہوتی ہے۔ ان کا کوئی اصلی رنگ ہوگا، مگر میں جس وقت چاہوں، ان کا رنگ تبدیل کر سکتا ہوں۔ جس قدر میری آنکھوں کے رنگ، میرے کام آتے ہیں، ہاتھ بھی نہیں آتے۔ میں تو یہ بھی سوچتا ہوں کہ آنکھوں کے ہوتے ہوئے آدمی کی زبان ایک عضوِ زائد ہے۔ آدمی اپنی زبان کو لذت تک محدود رکھتا، افسوس اس نے اسے خواہ مخواہ بولنے کے

Scanned with CamScanner

لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ میرے پاس ایک دوست آئے۔ انھوں نے، شاید... ہاں مجھے یاد آیا، ایک بھیڑیے کا چہرہ چڑھا رکھا تھا۔ خیر، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے پاس کافی چہرے ہیں، اور اس وجہ سے کافی مشہور اور اس سے زیادہ کامیاب ہیں۔ لیکن اس دن وہ شاید جلدی میں تھے، اس لیے ڈھنگ سے بھیڑیے کا چہرہ نہیں چڑھا سکے تھے، ان کا آدمی والا چہرہ کچھ کچھ نظر آ رہا تھا۔ ذرا بد صورت لگ رہے تھے، اور اچھی طرح پہچانے جا رہے تھے۔ مجھے ان سے ہمدردی ہوئی۔ اگر انھوں نے اس بے ڈھنگے پن کو وطیرہ بنا لیا تو مارے جائیں گے، مطلب وہ مزید کامیابیاں حاصل کرنے میں مشکلات کا شکار ہوں گے۔ میں نے اپنی آنکھوں کا رنگ سرخ کر لیا۔ وہ میری زبان کھلنے اور ہاتھ کو جنبش دینے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ میں نے ان کے حق میں دعا کی۔ یہ انھی میں سے ایک تھے، جو اپنا اسم لے کر آئے تھے۔

میں نے یہ جاننے کے لیے ایک سفر کیا کہ میرا اسم کیا ہو؟ یہ سفر اپنے آبائی گھر کا تھا۔ مجھے اماں نے بتایا تھا کہ حویلی کے بڑے دروازے کے آگے، بس آٹھ دس قدم کے فاصلے پر میری آنول نال گاڑی گئی تھی۔ میں نے اماں سے کہا کہ میری ابتلا کی کہانی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اسے ختم بھی یہیں ہونا چاہیے۔ میں آنول نال تو شاید حاصل نہ کر سکوں، مگر جس مٹی میں وہ ملی، اسے اپنے اس ماتھے پر لگا لوں، شاید اس سے کھوپڑی کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ مجھے کئی بار محسوس ہوا ہے کہ اصل میں نہ ماتھا میرا ہے، نہ کھوپڑی میری ہے۔ اگر کوئی میری کھوپڑی میں آ کر دیکھے.... میں ان دنوں ریشم کی ڈوریوں سے ایک ایسی سیڑھی تیار کر رہا ہوں، جس کا ہر پایہ اگلے پائے کی طرف بول کر راہنمائی کرے گا۔ یہ سیڑھی میری کھوپڑی کی دنیا میں پہنچے گی۔ مجھے یقین ہے جو لوگ ریشم کی ڈوریوں کا ڈر دور کر کے، اس سیڑھی پر چلتے ہوئے آئیں گے، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ میری کھوپڑی میں کچھ بھی میرا نہیں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے، کس کس دیس، کن کن زمینوں سے، کن کن زمانوں سے، اور زمینوں اور زمانوں سے باہر کی سمجھ میں نہ آنے والی دنیاؤں سے چیزیں اس کھوپڑی میں موجود ہیں۔ اتنی سی کھوپڑی میں اتنا کچھ، اور وہ بھی سب باہر کا، کسی اور جہان کا۔ کم از کم اس آنول نال کی مٹی ایک ایسی چیز ہے، جس کا تعلق باہر کی کسی اور دنیا سے نہیں ہے۔ جوں ہی میں نے وہ مٹی ماتھے پر لگائی، مجھے پہلا

Scanned with CamScanner

خیال یہ آیا کہ آخر اپنا اسم تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں نے سامنے دیکھا تو ایک کمی کا احساس ہوا۔ اس جگہ شیشم کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ دائیں طرف دیکھا دو تین چھوٹی جھاڑیاں نظر آئیں۔ میرے دل کو کچھ کچھ اطمینان محسوس ہوا۔

لیکن چند ہی دنوں بعد پھر مجھے خیال آیا کہ نہیں، جس طرح میرے انگوٹھے کی لکیریں کسی سے نہیں ملتیں، میرا اسم بھی ہو، اور وہ کسی اور کے اسم سے نہ ملتا ہو۔ مجھے ایک آواز سنائی دی، مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آیا کہ ٹھیک ٹھیک کیا کہا گیا تھا، اور کون تھا۔ کھوپڑی میں اتنا کچھ باہر سے آ گیا ہے کہ آوازوں کو ٹھیک طرح سے پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ آواز سنائی دے، اور سمجھ نہ آئے تو آدمی ڈرتا رہتا ہے۔ آدمی ڈرتا رہے تو کوئی بات پلے نہیں پڑتی، اور ڈر مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے میں نے جلدی جلدی خود ہی اس آواز کا ایک مطلب گھڑ لیا، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کسی بھی آواز کا کوئی بھی مطلب گھڑا جا سکتا ہے، اور وہ کام بھی دے جاتا ہے۔ دنیا میں اربوں لوگ ہیں۔ سب کے اپنے اپنے اسم ہوں گے، اور ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے تو جھگڑیں گے۔ میں نے ایک بار ایک دوست کا نام ذرا بگاڑ کر پکارا تو ایک لمحے میں، یا اس سے بھی کم وقت میں، اس نے اپنا منھ کھولا، مجھے لگا کوئی بھوت ہے، جس کے منھ میں دانت نہیں بڑے بڑے بھالے ہیں۔ مجھے کچا چبانے ہی کو تھا کہ میں نے معافی مانگی۔ بھوت تو غائب ہو گیا، مگر دانت وہیں بھول گیا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ تب کہیں وہ تیز دھار والے بھالے اپنے منھ میں واپس لے گیا۔ میں حیران ہوا کہ کس آسانی سے اس نے اتنے بڑے، نوکیلے بھالے کو اپنے چھوٹے سے منھ میں کہیں چھپا لیا۔ یہ میرا دوسرا دوست تھا جو اپنا اسم لے کر آیا تھا۔

میں نے سوچا، اپنے اسم وسم کو چھوڑو، کوئی اور بات سوچو۔ تبھی مجھے ایک نئی بات سوجھی۔ کیوں نہ دوسروں کے اسم میں جھانک کر دیکھوں کہ ان میں ہے کیا؟ لیکن فوراً ڈر نے آ لیا۔ اسم تو بڑی ذاتی قسم کی چیز ہے، اور ذاتی چیزوں اور چہروں کو پہلے ہی دیکھ کر میں کافی ڈرا ہوا ہوں۔ کیوں نہ میں کسی بھی اسم یعنی کسی بھی لفظ کے اندر جھانک کر دیکھوں کہ اس کے اندر ہوتا کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے۔ میں نے گویا فیصلہ کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں کس لفظ کا انتخاب کروں؟ وہ لفظ ایسا ہونا چاہیے جو کسی اور کا نہ ہو۔ ایک بار تو لگا کہ کوئی لفظ بھی کسی ایک شخص کا نہیں۔ میرا نام ہی لے لیجیے۔ مجھ سے پہلے ہزاروں لوگ

Scanned with CamScanner

میرے نام کے گزرے ہیں۔ کبھی جھوٹ، کبھی سچ بولنا میری عادت ہے۔ یہی کچھ ہزاروں لوگ کرتے ہیں۔ میں جھوٹ بول کر بھی لفظ جھوٹ کو اپنا نہیں کہہ سکتا۔ جہاں تک عادت کی بات ہے، یہ بھی مجھ سے مخصوص نہیں۔ رفتہ رفتہ کھلا کہ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں، جو مجھ سے یا کسی اور شخص سے مخصوص ہو۔ اس سے مجھے تھوڑی سی آزادی اور راحت کا احساس ہوا۔ شکر ہے، جھوٹ کا لفظ مجھ سے مخصوص نہیں۔ یہ اس جوتے کی طرح ہے جو غسل خانے کے باہر پڑا رہتا ہے، اور ہر ایک اسے پہن کر نہانے جا سکتا ہے۔ لیکن.... لیکن بھائی جب وہ جوتا باہر لے کر آتا ہے تو اس پر کچھ میل کچھ پانی، تھوڑا لمس ہوتا ہے، جو اس شخص کا ہوتا ہے جو اسے پہن کر گیا ہوتا ہے۔ اور ہاں، وہ جوتا کچھ کچھ گھس بھی تو جاتا ہے۔

گھسا ہوا جوتا ہر ایک کا ہے، اور کسی کا بھی نہیں۔

جب گھر میں ہی گھسا ہوا جوتا موجود ہو، پھر اتنی دور جوتے گھسا کر جانے اور ایک اور جوتا، اور وہ بھی کسی اور کا گھسا ہوا جوتا لانے کی کیا ضرورت ہے!!

◎ ◎

بے سر کا نسوانی دھڑ

کوئی زیادہ پرانا قصہ نہیں، ایک شہر میں ایک عورت اور مرد ہوا کرتے تھے۔ اس شہر میں اور بھی بہت سے مرد اور عورتیں تھیں، مگر ان دونوں کے پاس ایک ایسا فن تھا، جو دوسروں کے پاس کم کم تھا۔ عورت کے پاس دیکھنے کا فن تھا، جب کہ مرد کے پاس، دوسروں کو وہ کچھ دکھانے کا فن تھا، جس سے دوسرے مسحور ہو جایا کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے مگر ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دونوں ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔

عورت کبھی پوری طرح سامنے نہیں دیکھ پاتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کبھی اِدھر، کبھی اُدھر مڑتی رہتی تھی۔ جو کچھ ایک طرف نظر آتا، وہ سائے اور کافی ساری شبیہوں کی صورت اختیار

Scanned with CamScanner

کر لیتا، اور جوں ہی وہ دوسری طرف دیکھتی، وہ سائے اور شبیہیں اس کی آنکھ کی پتلی پر آ کر ٹھہر جاتے، اور سامنے جو کچھ موجود ہوتا، اس سے یہ چپک جاتے۔ ایک طرف کے سائے، دوسری طرف کے جسموں سے، اور دوسری طرف کے سائے، پہلی طرف کے جسموں سے لپٹ جاتے، اور کچھ ایسے نظر آتا جیسے کچے رنگوں سے بنی کسی تصویر پر اچانک پانی گر جائے۔ رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک بہت بڑی تصویر کو دیکھ رہی ہے، جس میں کوئی نقش واضح نہیں۔ کچھ مزید دن گزرے تو اسے اِدھر اور اُدھر آپس میں گڈمڈ نظر آنے لگے۔ کبھی اسے لگتا کہ آدمی کی ناک کی جگہ، کسی جانور کا کان لگا ہوا ہے، کبھی کسی درخت پر اسے بے آنکھ کے انسانی چہرے دکھائی دینے لگتے۔ کبھی لگتا کہ کچھ لوگوں کے جنسی اعضا ان کی زبانوں سے لٹک رہے ہیں، اور کچھ کے منھ بالکل نسوانی جنسی عضو کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اسے کبھی یہ بھی محسوس ہوا کہ کچھ لوگوں کی کھوپڑیوں کا آدھا حصہ باقی نہیں رہا، اور دکھائی دینے لگا ہے کہ ان کے اندر کوئی ویران کھنڈر ہے، گرے ہوئے ستون ہیں، چھتیں ٹوٹی ہوئی ہیں، پرانی اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہیں، اور کچھ ننگ دھڑنگ لوگ پھر رہے ہیں، مگر ایک دوسرے سے یکسر لاتعلق۔ کچھ کھوپڑیوں میں اسے غار دکھائی دیا، جس میں ایک جگہ آگ جل رہی تھی، اور ادھر کچھ لوگ زنجیروں میں جکڑے تھے، جن کے سامنے ایک دیوار تھی؛ اسے وہیں ایک پردہ سا بھی دکھائی دیا، جس پر عجیب وغریب سائے ناچ رہے تھے، اور کچھ ایسی عجیب و ہیبت ناک شکلوں میں ڈھل رہے تھے، جسے اس نے صرف اپنے خوابوں میں دیکھا تھا، اور جنھیں وہ کوئی نام دینے سے قاصر رہتی تھی۔ زنجیروں میں جکڑے لوگ چیختے تھے، مگر ان کی چیخیں پاس کھڑے آدمی کو بھی سنائی نہیں دیتی تھی کہ سب ہی چیخ رہے تھے، اور ان کی چیخیں آگ میں جا گرتی تھیں، اور آگ مزید بھڑک جاتی تھی۔ آگ کا ایسا ایندھن اس نے کبھی اِدھر دیکھا تھا نہ اُدھر۔ اس نے دیکھا کہ ان خالی کھوپڑیوں سے باہر لوگ، ان سے لاتعلق گزر رہے تھے۔ لیکن ایک کھوپڑی کا منظر عجیب وغریب تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کہن سال مرد کی ٹانگوں میں تین سال کی بچی پھنسی ہے۔ وہ حیران ہوئی کہ بچی چیخ نہیں رہی، مگر مرد کے چہرے پر عجب سرمستی کی کیفیت ہے۔ کچھ کھوپڑیوں کے خالی حصے میں اس نے جھانک کر دیکھا تو وہاں ایک اور عجب منظر تھا۔ شیشے کی دیواروں سے بنی عمارت تھی، اعلیٰ، جدید قسم کا فرنیچر تھا، قیمتی لباس پہنے لوگ موجود

Scanned with CamScanner

تھے۔ایک کمرہ مذبح خانہ تھا،جس میں تین آدمی تھے۔وہ پہلے آدمیوں کو ذبح کرتے ،ان کی چیخوں سے خوش ہوتے ،پھران کے ٹکڑے کر کے ،ملحقہ کچن میں بھیج دیتے۔اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کو لایا گیا۔تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔اس کی مشکیں کسیں۔اس کی جنیز کی زپ کھولی۔واہ! دوسرے نے چھری سے وہیں سے جینز چاک کی۔تیسرے نے کہا، میں پہل کروں گا،تم ناتجربہ کار ہو۔جب وہ چلائی اور ہاتھ پاؤں چلائے تو پہلے نے اس کا گلا دبادیا۔تینوں نے باری باری اسی میز پر، جہاں گوشت کاٹتے تھے،اس ٹھنڈے ہوتے بدن میں اپنی اکڑن داخل کی۔اس کے بعد تین اورلوگوں کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے پارچے بنائے ،اور کچن کی طرف روانہ کیے۔اس نے کھوپڑی کا یہ منظر دیکھنے کے بعد، دوسری طرف دیکھا۔اس مرتبہ سائے گھنے ہو گئے تھے،اور شبیہیں جسم بن گئی تھیں۔دیکھا کہ سامنے کچھ لوگ ننگے ہو کر ناچ رہے تھے، گانے گا رہے تھے، کچھ تقریریں کر رہے تھے، کچھ خراٹے لے رہے تھے۔خراٹوں میں جینز کے چاک ہونے کی آواز گھستی معلوم ہو رہی تھی، گانے میں اس تین سالہ بچی کی بند ہوتی آنکھوں سے پیدا ہونے والی ندا شامل ہو رہی تھی، تقریروں پر وہ سب بے چہرہ سر ہلتے نظر آرہے تھے جو اس نے درختوں کی شاخوں پر دیکھے تھے۔ننگے ناچتے جسموں پر خون کی بارش ہوتی محسوس ہو رہی تھی ،مگر وہ قہقہے لگا رہے تھے ،اور ان قہقہوں میں کچھ مقدس لفظ اور کافی سارے فحش لفظ ،ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو رہے تھے ،اور کسی فحش لفظ کا کوئی حصہ ،مقدس لفظوں کے شروع ،درمیان یا آخر میں شامل ہو کر،ایک عجب صورت پیدا کر رہا تھا۔

اچانک اسے لگا کہ کوئی ایک نوک دار شے ،اس کی کھوپڑی پھاڑ کر باہر کی طرف نکلی ہے۔سب نے دیکھا کہ شہر میں پرندوں سے ملتی جلتی ڈھیر ساری شبیہیں نمودار ہوئی ہیں، جو تھوڑی دیر اڑتی ہیں ،اور پھر گر پڑتی ہیں۔جہاں گرتی ہیں، وہاں سیاہی کا ایک نقطہ نمودار ہو جاتا ہے۔اگلے ہی دن لوگوں نے دیکھا کہ بغیر سر کا ایک نسوانی دھڑ شہر میں نمودار ہو گیا ہے۔وہ کبھی کہیں ہوتا ہے، کبھی کہیں۔اس شہر میں کچھ واقعات کثرت سے دہرائے جاتے تھے۔مثلاً ایک طرف کسی جگہ انسانی لوتھڑے گرتے ،خون کی دھاریں کئی گھروں کے صحنوں میں جاگرتیں،اور دوسری طرف کچھ لوگ ننگی حالت میں ناچنے لگتے ،اور کچھ تقریریں کرنے لگتے ،اور کچھ شہر کی دیواروں پر ایک نہ سمجھ میں آنے والی

Scanned with CamScanner

زبان میں کچھ لکھنے لگتے، اور کھانے کے ہوٹلوں میں بھیڑ بڑھ جاتی، اور سینماؤں، یونیورسٹیوں کے کانفرنسوں ہالوں اور شہر کے ثقافتی مراکز میں سرگرمیاں بڑھ جاتیں۔ ایک دن جب یہی واقعہ دہرایا گیا تو ایک چوراہے پر شام کے وقت، جب وہاں ذرا بھیڑ کم تھی، اس دھڑ کو کچھ سیاہ نقاب پوشوں نے (اس لیے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ آدمی تھے، یا کوئی اور مخلوق) ادھیڑ ڈالا۔ لیکن اس واقعے کی اطلاع اس لیے نہ ہوسکی کہ ایک تو وہ دھڑ چیخنے سے قاصر تھا، دوسرے کچھ لوتھڑے اکٹھے کرنے میں مصروف تھے، اور باقی ناچنے یا خراٹے لینے میں، یا ہوٹلوں، کانفرنس ہالوں میں مصروف تھے۔

اس مرد کو آگے یا پیچھے دیکھنے کی عادت تھی۔ جب وہ آگے دیکھتا تو ایک مجمع لگالیتا۔ یہ دیکھو، سونے سے بنے محل، سنہرے بدن، شفاف چشمے، بلوریں پیالے، دودھ کی نہریں۔ پیچھے دیکھتا، تب بھی ایک مجمع جمع ہوجاتا۔ وہ دیکھو مرمر سے بنے محل، تلواریں، سپاہ، اونٹ، خیمے، قدموں پہ جھکے لاکھوں سر۔ اس کے گرد جمع ہونے والا مجمع، اس کے عقیدت مندوں میں بدل جاتا۔ وہ جو کچھ کماتے، اس کا بڑا حصہ اس کے قدموں میں ڈھیر کردیتے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکرادا کیا، جس نے آگے یا پیچھے دیکھنے کی صلاحیت دی، اور اس سے بڑھ کر اس کا اجرا اسی دنیا میں دیا، اور اس قدر دیا! اس نے اس دیکھنے کے فن کو مزید ترقی دی۔ اس نے کچھ اس طرح سے اپنے دیکھے کو بیان کرنا شروع کردیا، جیسے وہ سب اس کے سامنے موجود ہے۔ اس کے گرد جمع ہونے والا مجمع بھی خود کو کبھی سونے کے محل میں گاؤ تکیہ لگائے، چمکتے جسموں کے جھرمٹ میں محسوس کرتا، اور کبھی آب انگور سے سرمست و بےخود پاتا۔ ایک روز، جب وہ اپنے سفید مرمر کے محل میں گاؤ تکیہ لگائے آگے کی طرف دیکھ رہا تھا، اور جوق در جوق لوگ آرہے تھے، اس کے قدموں میں سر اور نقدی رکھ رہے تھے، اور وہ بیان کررہا تھا کہ وہ آگے دیکھو، چار نہیں، جس کی یہاں اجازت ہے، دس بارہ یا جتنے تم چاہو، نوجوان بدن، سیپ کی طرح بند، جنھیں نہ آدمی نے دیکھا نہ کسی اور مخلوق نے، تمھارے، صرف تمھارے لیے، اپنی تنی، بلوریں چھاتیاں ننگی کیے، اپنی سڈول، مرمر کے مجسّمے کی طرح تراشی پنڈلیاں ننگی کیے، تمھاری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی لجاتی، تمھاری آتش شوق کو بھڑکاتی تمھارے سامنے موجود ہیں۔

Scanned with CamScanner

ٹھیک اسی وقت وہی نسوانی دھڑ وہاں آن پہنچا۔ مجمع کو یقین ہو گیا کہ جو کچھ ان کے سامنے کہا جا رہا تھا، وہ ان کے آگے واقعی موجود ہے۔ وہ ایک سرشاری کی حالت میں تھے، جس کی تہ میں ان کا ایک صدیوں پرانا یقین بھی کارفرما تھا۔ وہ صدیوں سے مانتے چلے آ رہے تھے کہ نسوانی دھڑ پر سر نہ ہوتا ہے، نہ ہوا کرتا تھا، نہ ہو سکتا ہے۔

اس دھڑ کو دوسری مرتبہ بھنبھوڑ ڈالا گیا، لیکن وہ آدمی ان میں شامل نہیں تھا۔ وہ اچانک وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

وہ اپنے مرمر کے محل کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ ایک لمحے کو اس نے حساب لگایا کہ آج کس کمرے کی باری ہے۔ ہاں، رخشندہ۔ محنت کوئی بھی ہو، آدمی کو تھکا دیتی ہے، مگر محبت آدمی کو اگلے دن کی محنت کے قابل بناتی ہے۔ اس نے اس کے کولھے تھپتھپاتے ہوئے گاؤ تکیہ لگے بستر پر کھینچتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے کولھوں سے ہاتھ چھاتی کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ایک شور سنائی دیا۔ ایک ہی پل میں اس نے محسوس کیا کہ کچھ نسوانی چیخیں، اور کافی ساری مردانہ جوش بھری آوازیں ہیں جو اس کمرے سے ملحق کمروں سے آ رہی ہیں۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا، مگر رخشندہ نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد، اپنا لباس ایک طرف اتار پھینکا، اور وارفتگی کے عالم میں اس کی طرف بڑھی۔ چھوڑو، وہ اسی قابل ہیں۔ یہ کہہ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

جب وہ ہانپ چکا تو اس نے دیکھا کہ بستر پر بغیر سر کا ایک عریاں نسوانی دھڑ پڑا ہے۔

◎ ◎
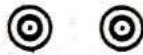
دلفگار نے خاموشی توڑ دی

بالآخر دلفگار نے اپنی خاموشی توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ملکۂ دلفریب، میں کس منہ سے تمھارے ان سب لطف ہائے خاص کا شکر ادا کروں، جن کا

Scanned with CamScanner

سزاوارتم نے مجھے سمجھا۔اس سے بڑا لطف کیا ہوگا کہ تم نے اپنی بارگاہِ حسن میں باریابی کی میری درخواست کو قبولیت کا شرف بخشا۔تم نے بس یہ شرط رکھی کہ پہلے میں دنیا کا سب سے انمول رتن تلاش کرلاؤں۔میں سچ کہتا ہوں اگر یہ شرط نہ ہوتی تو مجھے تمھارے ملکہ حسن ہونے میں شک ہوتا۔باقی بارگاہوں تک ہر عام وخاص کو رسائی حاصل ہو،اس میں حرج نہیں،مگر حسن کی بارگاہ میں تو بس اسی کو اجازت ہونی چاہیے جو دنیا کی سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر،بس حسن کے دامن سے سدا کے لیے وابستہ ہونے کی اہلیت رکھتا ہی نہ ہو،اسے ثابت بھی کر سکے۔اسی لیے جب تم نے کہا کہ میں دنیا کا سب سے انمول رتن تلاش کرلاؤں تو میں نے خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص سمجھا۔مجھے تب یقین تھا کہ تمھیں رتن نہیں چاہیے، میری اہلیت کا امتحان درکار ہے۔میں ایک رتن لایا،دوسرا رتن لایا۔ بالآخر تمھیں تیسرا رتن پسند آیا۔تم نے اسے انمول کہا اور اس کے بدلے،تم نے مجھے اپنی غلامی میں قبول کرلیا۔لوگ غلام خریدتے ہیں،میں نے دنیا کے سب سے انمول رتن کے بدلے غلامی خریدی۔ ملکۂ دلفریب،ایک صدی تک میں اس غلامی میں شادکام رہا۔پر میں آج کہتا ہوں یہ بہت برا ہوا۔

کوئی ایک صدی بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا جنون قدیمی تھا،مگر تم نئے زمانے کی ملکہ حسن تھیں۔مجھ مورکھ کو دھوکا اس لیے بھی ہوا کہ تم نے نام پرانا اختیار کر رکھا تھا،اور پرانے زمانے کی ملکہ حسن ہی کی طرح یہ شرط رکھی کہ میں پہلے تمھارے سوال کا جواب تلاش کرلاؤں کہ دنیا کا سب سے انمول رتن کون سا ہے۔میں آج سرِعام اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میری آنکھیں تمھارے حسن سے چندھیا گئی تھیں،اس لیے میں تمھاری آنکھوں میں چھپی،نئے زمانے کی چالاکی سمجھ نہ پایا،اور ایک صدی تک سمجھ نہ پایا۔غلام کو تمھارے قدموں میں جگہ ملی تھی،اور کبھی کبھی آغوش کی گرمی بھی نصیب ہوجاتی تھی،اس لیے تمھاری آنکھوں میں جھانک ہی نہ سکا۔غلاموں کو جاگنے میں یوں بھی کافی وقت لگتا ہے۔

سب سے پہلے میں تمھارے حضور اس کالے چور کا آنسو لایا،جو اس کی آنکھ سے پھانسی سے ذرا پہلے ایک بچے کو کھیلتے دیکھ کر ٹپکا تھا،جو لکڑی کے ایک فرضی گھوڑے پر اس طرح ناچ رہا تھا،جیسے وہ عربی رہوار کا شہسوار ہو؛ کالے چور کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔تم نے میری ہمت کو آفرین کہا اور میری فراست پر مرحبا کہا،مگر اسے دنیا کا سب سے انمول رتن نہیں کہا۔میں تمھاری بات مان

گیا۔ حالاں کہ جب میں نے وہ دریکتا ہاتھ میں لیا تھا تو میرے دل نے کہا تھا کہ وہ کالا چور سہی، پھانسی کا سزاوار سہی، مگر جب اس نے آنسو بہایا تھا، اس نے چور اور موت دونوں کو شکست دے دی تھی۔ وہ نہ خوشی کا آنسو تھا، نہ افسوس وندامت کا۔ یہ آنسو تو ہر وقت، ہر جا نظر آتے ہیں، اور رتن کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ آنسو موت سے پہلے، موت کے آگے، موت کے سر پر منڈلانے کی سنگین حقیقت کے بالمقابل ایک تبسم تھا، اس بچے کو خراج تحسین تھا جو اپنی جنت اور بادشاہت میں آزادانہ پھر رہا تھا، اسے نہ تو دوسروں کی بادشاہت پر قبضہ کرنا تھا نہ اسے اپنی جنت کے چھن جانے کا کوئی ڈر تھا۔ ہاں، اس آنسو میں ایک پرانی یاد کی ٹمٹماتی لو بھی تھی، جو میں نے دیکھی تھی؛ اس کالے چور کو یاد آیا کہ یہ جنت اور بادشاہت اس کے پاس بھی ہوا کرتی تھی۔ اس نے جو مال وال چرایا تھا، وہ سب تو غتر بود ہو گیا، مگر اس جنت کی یاد پہلے سے زیادہ چمکیلی ہو گئی تھی۔ اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اس دریکتا پر تخت طاؤس، جام جم، آب حیات، اور زر پرویز سب تصدق ہیں کہ یہ سب چھینے ہوئے ہیں۔ میں آج کہتا ہوں، میں جاہل ہی نہیں تھا، ظالم بھی تھا۔ میں نے دل کی گواہی پر تمھاری رائے کو مقدم جانا، یہ میری جہالت تھی۔ تم نے ایک جنگی سورما کے آخری قطرہء خون کو دنیا کا سب سے انمول رتن کہا۔ میں مان گیا، یہ میں نے ظلم کیا۔ میں بھری دنیا کے آگے اپنی جہالت، ظلم، غفلت، اور حسن کے لالچی ہونے کا اقبال کرتا ہوں۔

میں تمھارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے دنیا کے سب سے انمول رتن کی تلاش کے سفر پر روانہ کیا۔ جن آنکھوں کو بھرے جہان میں تمھارے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، انھی آنکھوں کو یہ موقع ملا کہ وہ دنیا کی سب سے قیمتی شے تلاش کریں۔ جب تم نے یہ کہا تھا کہ میں سب سے انمول رتن تلاش کرلاؤں تو تھوڑی دیر کے لیے میں سٹپٹایا تھا کہ تمھارے حسن کے سوا بھی کوئی انمول رتن ہوسکتا ہے! لیکن تمھارے حکم کی تعمیل مجھ پر لازم تھی۔ حکم کی تعمیل تک بات رہتی تو میرے ہی نہیں، اس دنیا کے حق میں بھی بہتر ہوتا۔ میں نے حکم کی تعمیل سے آگے، تمھیں ہر بات میں حکم بنالیا۔ یہ ہم سب کے حق میں برا ہوا۔

میں نے سفر کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔ میں نے ایک نہیں، کئی انمول رتن تلاش کیے بھی اور نہیں

Scanned with CamScanner

بھی۔ یہ بھید مجھ پر کوئی ایک سو برس بعد کھلا ہے۔ اس سفر میں میرے پاس ایک زبردست موقع تھا۔ آدمی جب دنیا کی سب سے قیمتی شے کی تلاش میں ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کو دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ نقلی چیزوں تک کو دیکھتا ہے، تاکہ اسے اصلی کی پہچان ہو سکے۔ وہ چھوٹی چیزوں کو اچھی طرح دیکھتا بھالتا ہے تاکہ وہ جان سکے کہ وہ کون سی بات ہے جو چھوٹی چیز کو بڑی چیز سے الگ کرتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو غور سے سنتا ہے تاکہ بڑی باتوں کی معرفت حاصل کر سکے۔ وہ دشمن کا ڈنک سہتا ہے تاکہ دوستی کی شیرینی کی پہچان کر سکے۔ میرے پاس بڑا موقع تھا یہ جاننے کا کہ سب سے قیمتی چیز تک پہنچنے کا مطلب ہر چیز تک پہنچنا ہے، مگر میں نے یہ بڑا موقع گنوا دیا۔ میں نے تو اس سفر میں دنیا کو اس بھوکے بھکاری کی طرح دیکھا جو ہر شے کو پھرولتا ہے، اور ہر شے کو پھینکتا جاتا ہے تا آں کہ اسے روٹی کا ایک ٹکڑا یا کوئی سکہ مل جاتا ہے۔

میں نے دنیا دیکھی، لیکن تمھاری آنکھوں سے۔ تمھاری آنکھوں سے بھی دنیا دیکھنے میں قباحت نہیں تھی۔ آدمی کو چار آنکھیں مل جائیں تو وہ سب بھی نظر آنے لگتا ہے جو دو آنکھوں کی حد اور زد میں نہیں آپاتا۔ ظلم یہ ہوا کہ میں یہ نہیں جان سکا کہ تمھاری آنکھوں میں عیاری تھی، جس نے میری آنکھوں ہی کو بند کر دیا تھا۔ مانو میری آنکھیں تھی ہی نہیں۔ ورنہ جب میں نے ایک سندر ناری کو ستی ہوتے دیکھا تھا تو مجھے آگے بڑھ کر اسے بچانا چاہیے تھا۔ اس کی راکھ کے بجائے خود اس کو انمول رتن سمجھنا چاہیے تھا۔ ایک پل کے لیے مجھے خیال آیا تھا کہ میں جاؤں، اس کی گود میں پڑی اس کے شوہر کی لاش کو چتا میں ڈالوں اور اسے بچالوں۔ پھر اسے یقین دلاؤں کہ محبت کو امر کرنے کا یہ طریقہ بھیانک ہے۔ آج میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں ڈر گیا تھا۔ اگر میں اس سندر ناری کو انمول رتن سمجھ کر تمھارے حضور لایا تو کہیں تم اسے میرے پہلو میں دیکھ کر، مجھے اپنی غلامی میں لینے سے انکار ہی نہ کر دو۔ مجھے تمھاری غلامی میں آنے کا اس قدر جنون تھا کہ ایک جوان، حسین عورت کو آگ کے شعلوں میں راکھ ہوتے دیکھتا رہا۔ میں نے ایک بار پھر ظلم اور جہل کا مظاہرہ کیا۔ میں آج یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے راکھ ہو جانے کا ذمہ دار میں بھی ہوں۔ میرے دل پر بڑا بوجھ ہے۔

ملکہء دلفریب، تم نے اس راکھ کی تکریم کی، مگر اسے انمول رتن نہیں کہا۔ ہائے میرا جہل، میں

Scanned with CamScanner

نہیں سمجھ سکا کہ تمھیں زندگی نہیں موت، راکھ، خون پسند ہے۔ مجھے اپنی جہالت پہ ندامت ہے۔ میں پرانے زمانے کا آدمی تھا... پر اب تو مجھے اس بات میں بھی شک ہے کہ میں آدمی ہوں بھی کہ نہیں۔ میں اس خیال کا اسیر تھا کہ دنیا میں بس دو ہی چیزیں ہیں: حسن اور محبت۔ میں یہ خواب لیے تمھارے حضور آیا تھا کہ میں جیسے جیسے تمھارے حسن کے اسرار سے آگاہ ہوں گا، مجھ پر محبت کی بے پناہ حلاوت کا راز آشکار ہوتا جائے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا راز یہی ہے، جس میں ہماری ہستی کے سب بڑے سوالوں کے جواب چھپے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم نے ہستی کے سوالوں کو صرف دنیا کی الجھنوں میں بدل دیا ہے۔ میں نادان کہاں جانتا تھا کہ میں جس دنیا سے بھاگ کر تمھارے پاس آیا، تم اس سے کہیں زیادہ خوف ناک دنیا کی دلدل میں دھکیل دوگی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ مجھے کوہِ بلند سے چھلانگ لگانے سے جس سبز پوش بزرگ نے روکا تھا، اور مشرق کے ایک ملک ہندوستان کی طرف جانے کا کہا تھا، وہ بزرگوار تمھارے ہی طرف دار تھے۔ میں تمھاری طرح انھیں بھی پرانے زمانے کا وہ بزرگِ دانش مند سمجھا تھا جو ہر مشکل میں اچانک نمودار ہوتے ہیں، اور نجات کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ہائے میرا جہل کہ میں نہ سمجھ سکا، تم نے نام اور سوال پرانے اختیار کیے، اور بزرگ نے حلیہ پرانا اختیار کیا۔ میں اسی سے دھوکا کھا گیا۔

میں پہلے دونوں رتن وہ لایا جو محبت اور وفاداری کے تھے، میں سمجھا حسن کی بارگاہ میں انھیں شرف قبولیت ملے گا۔ ہائے نادانی، میں نہیں سمجھ سکا کہ نئے زمانے کی ملکۂ دلفریب نے حسن اور خون میں سمبندھ ڈھونڈ لیا ہے۔

ملکہ دلفریب، مجھے آج یہ کہنے میں عار نہیں کہ سارا فساد ہی اس انمول رتن کا پیدا کردہ ہے۔ تم اپنی بارگاہ سے باہر کبھی نہیں نکلیں۔ تمھارے قدموں پر سر جھکانے والے، تجھے یہ دیکھنے کی مہلت نہیں دیتے کہ باہر کس قدر خون بہہ رہا ہے؛ گلیاں خون سے اس قدر بھری ہیں کہ سب کے پاؤں، ہاتھوں، کپڑوں، روحوں پر خون کے چھینٹے ہیں۔ کسی سے ہاتھ ملائیں تو ہتھیلی پر خون کے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ کسی سے بات تک کریں تو باتوں میں خون در آتا ہے۔ اکیلے بیٹھ کر سوچیں تو خیالوں میں خون اتر آتا ہے۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں تو میری باتوں سے خون کی دھاریں گر رہی ہیں، اور اس کاغذ پر پڑ

Scanned with CamScanner

رہی ہیں، لفظوں کے اندر اتر رہی ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو بہت ہی بھیانک ہے۔ ملکۂ دلفریب، تمھیں کچھ معلوم نہیں، اور مجھے بھی ایک صدی لگی ہے یہ سمجھنے میں کہ لفظوں میں جب خون اتر آئے تو دنیا کتنی بھیانک، کتنی ہولناک ہو جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو دونوں کے مونہوں پر خون کی دھاریں پڑتی ہیں، جس سے اور خون بہہ نکلتا ہے۔ لوگ ڈرتے ہوئے سوتے نہیں کہ خوابوں میں بھی خون شکلیں بدل بدل کر ظاہر ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے انسانوں کے مونہوں سے زبانیں کہیں رخصت ہوگئی ہیں، اور توپیں نصب ہوگئی ہیں، جو صرف خون کی زبان جانتی ہیں۔ ملکہء دلفریب، اس خون خرابے کا آغاز اسی وقت ہوا تھا، جب تم نے مجھے دنیا کا انمول رتن لانے کے لیے کہا، اور میرے پہلے دونوں لائے ہوئے رتنوں کو انمول کہنے سے انکار کیا۔

ملکہء دلفریب، میں انسانی خون کی تقدیس کے آگے سر جھکاتا ہوں، میں دل و جان سے تسلیم کرتا ہوں کہ کالے، گورے، ایشیائی افریقی، یورپی، امریکی، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی، سکھ، یہودی، بدھ، عورت مرد، خواجہ سرا سب کے خون کا رنگ ایک جیسا ہے، میں خدا کو حاظر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ خون اِس طرف گرے، یا اُس طرف، کتنے ہی چراغ بجھتے ہیں، کتنی ہی آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں اور سب آنسوؤں کا پانی نمکین ہوتا ہے... مگر میرے ضمیر پر سب سے بڑا بوجھ یہ ہے کہ میں نے ایک رتن کو انمول تسلیم کر کے کتنے ہی رتنوں کو مٹی میں رول دیا؛ ایک خون کے قطرے کی تعظیم میں خون کے دریا بہا دیے گئے۔ اس انمول رتن کی حفاظت ہمارا ایمان بن گیا۔ پرانے زمانے میں بادشاہ اپنے ہیروں کی حفاظت کی خاطر لاکھوں لوگوں کی جانیں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ فرق یہ پڑا ہے کہ اب ہیرا پتھر کا نہیں رہا۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں ایک صدی لگ گئی کہ غلامی میں کیے گئے فیصلے، آگے جاری رکھے جائیں تو کیا کیا قہر نازل ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنے میں بھی مجھے دس دہائیاں لگ گئیں کہ ایک رتن کو انمول کہنا، اتنا بڑا فیصلہ ہوتا ہے، جتنا بڑا فیصلہ کسی کی موت اور زندگی کا ہوتا ہے۔ دوسروں کی زندگی و موت کے فیصلے کا اختیار نئے زمانے کی ملکہ کے ہاتھ میں دینے میں میرا بھی ہاتھ ہے، میں اپنی خطا پر شرمندہ ہوں''۔

◎ ◎

Scanned with CamScanner

تیر کا دریا

اس نے دیکھا کہ جہاں تیر گرا تھا، وہاں دریا کے بجائے صحرا تھا۔
یہ کیسے ہو سکتا ہے؟
اسی طرح، جس طرح تیر سے دریا جنم لیتا ہے۔ کسی نے اسے کان میں کہا۔
جو بات صحیفے میں درج تھی، وہ یہ تو نہیں تھی۔
تم نے صحیفے میں درج بات کو یاد رکھا، اس کے مطلب کو نہیں سمجھا۔ کسی نے پھر سرگوشی کی۔
کیا کسی بات کا مطلب، بات سے الگ ہوتا ہے؟
نہیں، لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ اس نے صاف صاف سنا۔
میں بالکل نہیں سمجھا، وہ جیسے رو دینے کو تھا۔
بات کا مطلب، بات سے الگ نہیں ہوتا، لیکن ہر بات ایک کنویں کی طرح ہے، جس کا پانی اسی وقت، اور اتنا ہی باہر آتا ہے، جتنا اسے چلاؤ گے۔ پانی کنویں سے باہر آ جائے تو کنویں سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر اس کی ڈھارس بندھی۔
مگر میں تو صحرا میں ہوں۔ اس نے انتظار کیا، مگر اس مرتبہ کوئی آواز اور سرگوشی نہیں سنائی دی۔
اس نے سامنے صحرا کو دیکھا۔ اس کے قدموں سے شروع ہونے والا صحرا کہیں کہیں دریا بنتا نظر آ رہا تھا۔ یہ تو نظر کا دھوکا ہے۔ دریا اتنا چمکیلا نہیں ہوتا۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ پیچھے ایک فصیل تھی۔ اس نے واپس مڑنے کا ارادہ کیا۔ چند قدم چلا۔ رکا۔ پھر مڑا۔ وہی صحرا، جس کے درمیان سراب کے قطعات تھے، اس میں یہ فصیل کہاں سے آئی؟ اس نے جیسے پاس کھڑے کسی شخص سے سوال کیا۔ جہاں سے صحرا آیا۔ کسی نے سرگوشی کی۔ یہ کیسا معما ہے؟ ایک آدمی صحیفے میں پڑھتا ہے کہ "دیکھو، تمھیں جس کی تلاش ہے، وہ میرے پاس نہیں۔ وہ کسی کے پاس نہیں۔ تمھیں ایک دریا تک پہنچنا ہوگا۔ یہ دریا

Scanned with CamScanner

کہاں ہے، یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ ایک تیر چلا تھا، یہ تیر جہاں گرا تھا وہیں دریا وجود میں آیا۔ میں صرف ایک بات بتا سکتا ہوں، وہ تیر ایک ایسے پہاڑ سے چلا تھا جس کے سر پر ہر شام کو ایک سنہری تاج سجتا ہے، اسی پہاڑ سے تیر شمال کے رخ، وہاں تک گیا تھا جہاں ایک بڑا جنگل ہے''۔ وہ چل پڑتا ہے۔ ایک پہاڑ پر، دوسرے پہاڑ پر، تیسرے پہاڑ پر اور پھر دسویں پہاڑ پر جاتا ہے۔ اسی دسویں پہاڑ پر اسے سنہری تاج نظر آتا ہے۔ وہ رکتا ہے۔ اس کی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں، جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔ اس کا دل وہ کچھ محسوس کرتا ہے جو اس نے کبھی محسوس نہیں کیا ہوتا۔ وہ پلک جھپکنا بھول جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنے پہاڑوں کا سفر کیا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کتنے زمانوں سے چل رہا تھا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے شمال کے رخ کا تعین کرنا تھا۔ اچانک سیاہی کا ریلا آتا ہے۔ اسے لگتا ہے دنیا ختم ہوگئی۔ جانے کتنے زمانوں بعد وہ بیدار ہوتا ہے۔ جانے کتنے زمانوں بعد اسے یاد آتا ہے کہ وہاں سامنے ایک پہاڑ کے سر پر سونے کا تاج تھا، جہاں سے جانب شمال تیر چلا تھا۔ پہاڑ موجود تھا، پر تاج غائب۔ اس نے چلنا شروع کیا۔ ایک پہاڑ، دوسرا پہاڑ، بارھواں پہاڑ۔ اس بار وہ سوچتا ہے کہ اس کی آنکھیں یہ منظر پہلے دیکھ چکی ہیں، اور اس کا دل اس مرگ آسا مسرت سے آشنا ہو چکا ہے، وہ اس بار پلکیں جھپکتا ہے۔ شمال کو پہچانتا اور اس کے رخ چل پڑتا ہے۔ اسے زمانے یاد نہیں رہتے۔ تیر، جنگل اور دریا یاد رہتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے۔ سامنے جنگل ہے۔ چلتے چلتے وہ جہاں پہنچتا ہے، وہاں جنگل کہیں نہیں۔ دریا بھی نہیں۔ صحرا ہے۔ اسے کوئی بتاتا ہے کہ جیسے تیر سے دریا بنا، ویسے ہی صحرا بنا۔ جیسے صحرا بنا ، ویسے ہی فصیل بنی۔ خدایا، یہ کیسا معما ہے، کیسا اسرار ہے۔ وہ انتظار کرتا ہے۔ کوئی جواب دینے کو موجود نہیں ہوتا۔

اسے یاد آتا ہے۔ اس سارے سفر میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ تیر اس کے ہمراہ تھا۔ کہاں گیا تیر؟ وہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے کہ اس نے تیر کو پورے سفر میں اپنے ساتھ راہنما کے طور پر محسوس کیا، لیکن اسے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ تیر کس شے سے بنا تھا۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ ہاں، واقعی تم نے اپنی جان پر ظلم کیا، اس لیے نہیں کہ تم نے تیر کو نہیں دیکھا، بلکہ اس لیے کہ تم نے تیر کو اپنا راہنما سمجھا۔ اسے وہی مانوس آواز سنائی دی۔ اگر اب آ ہی گئے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ یہاں دریا کی

Scanned with CamScanner

جگہ صحرا کیوں کر بنا؟ جیسے دریا بنا، جیسے فصیل بنی۔ آواز نے بتایا۔ اچھا دریا کیسے بنا؟ جیسے تم یہاں پہنچے۔ آواز جیسے سیدھی اس کے کانوں میں سے آ رہی تھی۔ تمھیں یقین ہے کہ تم دریا کی تلاش میں آ رہے تھے؟ وہ یہ سن کر کانپ گیا۔

◎ ◎

یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے تم ایک جنگل میں ہو

دونوں عدالت جا پہنچے۔ منصف نے کہا کہ پہلے سفید ریش بزرگ اپنا مقدمہ پیش کریں۔

منصف محترم سے میری درخواست ہے کہ مقدمے کا آغاز ہی ، ناانصافی سے نہ کیا جائے۔ عدالت میں کسی کو عمر کی وجہ سے خصوصی استحقاق حاصل نہیں۔ سیاہ ریش جوان آدمی نے کھڑے ہو کر کہا۔

تم اپنے سارے دلائل ان کے بعد دے سکتے ہو۔ عدالت دلائل کو دیکھے گی ، عمر کو نہیں۔ منصف نے دھیمے مگر زوردار لہجے میں کہا۔

منصف محترم سے میری دوبارہ درخواست ہے کہ مقدمے کے آغاز میں ناانصافی کا شائبہ نہ ابھارا جائے۔ ان بزرگ کی سفید داڑھی اور عمر ہی کی بنا پر انھیں پہلے بات کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ عدالت ، اس اخلاقی اصول کو اپنا رہی ہے ، جس کے خلاف اس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ہے۔ سیاہ ریش نوجوان پھر کھڑا ہوا۔

جناب ، یہ شخص عدالت کو غیر ضروری دلائل میں پھنسا کر ، اصل مسئلے سے توجہ ہٹانا چاہتا ہے۔ عدالت سے التجا ہے کہ اسے خاموش کرایا جائے۔ سفید ریش بزرگ نے کہا۔

منصف محترم سے ایک بار پھر درخواست ہے کہ ان بزرگ کی اس دیدہ دلیری کا نوٹس لیا جائے۔ ابھی مقدمہ شروع ہی نہیں ہوا ، اور یہ مجھے سزا دلوانے پر تلے ہیں۔ سزا کا فیصلہ ، مقدمہ سننے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ سیاہ ریش جوان نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔

جناب ، یہ شخص عدالت کے انصاف کے عمل میں خلل ڈال رہا ہے۔ اس بات کو نوٹ کیا

Scanned with CamScanner

جائے۔ سفید ریش بزرگ نے منصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں نے منصف کی طرف دیکھا، وہ کسی کاغذ کا مطالعہ کرنے میں منہمک تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر منصف کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے رہے۔ منتظر رہے۔ بزرگ نے کچھ کہنے کی جسارت کا ارادہ کیا۔ جوان شخص نے منصف کو مخاطب کرنے کا عزم کیا، مگر دونوں ڈر گئے۔ کچھ دیر دونوں کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کس بات سے ڈرے۔ پھر کچھ کچھ سمجھے۔ وہ منصف سے نہیں، شاید اس کے انہماک سے ڈرے۔ نہیں، شاید وہ انہماک سے پیدا ہونے والی تعلق، اور لاتعلقی کی عجب صورتِ حال سے ڈرے۔ جس انہماک کا رخ تمھاری طرف ہونا چاہیے، وہ اگر کسی اور شے کی طرف ہو جائے تو اس سے بڑی گڑ بڑ پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے تم ایک جنگل میں ہو، اچانک ایک درندہ تم پر حملہ آور ہو، تم اپنی تلوار نکالو، اس پر تانو، پوری طاقت سے اس کی گردن پر وار کرو، مگر گردن تک پہنچتے ہی تلوار کی دھار یک قلم کند ہو جائے۔ زندگی میں یہ آخری گڑ بڑ ہو گی جو تم محسوس کرو گے۔ دونوں نے گڑ بڑ کو شدت سے محسوس کیا۔ پھر ایک لمحے میں انھوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بری طرح ڈر گئے تھے کہ تعلق اور لاتعلقی کی اس صورتِ حال کا خاتمہ نہ ہوا تو ان کی وہ مصیبت مزید بڑھے گی، جس سے نجات کی خاطر وہ اس عدالت میں آئے ہیں۔ سیاہ ریش جوان شخص نے پہل کی۔ بزرگِ محترم تم پہلے اپنا مقدمہ پیش کرو۔

سفید ریش بزرگ گویا ہوئے:

''جناب، یہ شخص میرا پڑوسی ہے۔ اس کی وجہ سے میری زندگی اجیرن ہے۔ یہ ہر وہ کام کرتا ہے، جس سے میری معمول کی زندگی بری طرح متاثر ہو۔ یہ رات کو اونچی آواز میں خدا جانے کیا پڑھتا رہتا ہے۔ میں ایک پل نہیں سو سکتا۔ میری طبیعت چڑ چڑی رہنے لگی ہے۔ میری خانگی زندگی برباد ہو گئی ہے۔ میں بیوی کو بلا وجہ ٹوکتا ہوں، بچوں کو بات بات پر سرزنش کرتا ہوں۔ اپنے دوست احباب سے بے زار رہتا ہوں۔ مین عبادت نہیں کر سکتا۔ میرا کاروبار برباد ہو گیا ہے۔ میں ان سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ رات کو خاموش رہیں، یا کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ میں نے محلے کے سب لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، کچھ نے میری تائید کی، کچھ نے نہیں کی، زیادہ تر نے کہا کہ یہ تمھارا باہمی مسئلہ ہے۔ جناب

Scanned with CamScanner

،جس مسئلے کے سبب ایک شخص کا جینا دو بھر ہو، وہ سب کا مسئلہ ہوتا ہے۔ایک شخص کا جینا مرنا، اس دنیا کا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ اس شخص کو کسی دوسری جگہ جانے کا حکم دیا جائے ،تا کہ میری زندگی بچ سکے''۔

اب تم اپنا جواب دے سکتے ہو۔عدالت نے سیاہ ریش جوان شخص کو مخاطب کر کے کہا۔

''منصف محترم، مجھے کچھ کہنے کی حاجت اب نہیں۔ان کے مقدمے کا ردّ ان کے مقدمے ہی میں موجود ہے۔ یہ اپنی خانگی، کاروباری، روحانی زندگی کی ناکامی کو قبول کرنے کے بجائے ،اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال رہے ہیں، اور مجھ پر ہی نہیں، خود پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ میرا مقدمہ بس یہی ہے کہ کسی اور کی خطا میرے سر نہ تھوپی جائے۔ آخر کسی دوسرے پڑوسی کو مجھ سے شکایت کیوں نہیں۔ میں اپنے گھر میں کس وقت کیا پڑھتا ہوں اور کیسے پڑھتا ہوں، اس کا جواب دہ میں عدالت کو بھی نہیں ہوں۔ میرے گھر، میرے جسم، میری ذات پر کسی اور کو اختیار کا دعویٰ کیوں کر ہوسکتا ہے؟''

منصف نے دونوں کا مقدمہ سنا، کچھ دیر توقف کیا۔ پھر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کیا۔اگلی پیشی ایک ماہ بعد رکھی گئی۔

ایک ماہ بعد دونوں پھر اسی عدالت میں حاضر تھے۔منصف نے پہلے ایک شخص کی طرف دیکھا، پھر دوسرے کی طرف۔ آنکھیں جھپکیں۔ پھر پہلے کو دیکھا، دوسرے کی طرف نگاہ کی۔عدالت میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔سب نے منصف کی پریشانی بھانپ لی، کیوں کہ وہ خود بھی اسی پریشانی میں مبتلا تھے۔سب نے دیکھا کہ آج دونوں ہی کی ریش سفید تھی۔دونوں بزرگ بھی لگ رہے تھے۔ دونوں کے چہرے بھی ایک جیسے لگ رہے تھے۔بس لباس مختلف تھا۔

منصف نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، تمھیں کچھ مزید کہنا ہے۔

وہ گویا ہوا:

''جناب ان کی وجہ سے میری زندگی اجیرن ہے۔ یہ خدا جانے رات کو کیا پڑھتے رہتے ہیں۔میری بیوی بچے....''

Scanned with CamScanner

منصف نے اسے ٹوکا۔عدالت کا وقت مت ضائع کریں۔کوئی نئی دلیل،کوئی اور شکایت ہے تو عدالت کو بتائی جائے۔

''منصف محترم، یہ نئی شکایت ہے۔میں نے گزشتہ پیشی میں ان کے مقدمے کا جواب دیا تھا....''

منصف واقعی سٹپٹا گئے تھے،مگر چپ رہے۔تھوڑے وقفے کے بعد دوسرے سفید ریش بزرگ کی طرف متوجہ ہوئے۔تمھیں کچھ کہنا ہے؟

''جی ہاں،جناب،ان کے مقدمے کا رڈ،ان کے اپنے مقدمے میں موجود ہے.....''

منصف کا صبر جواب دے گیا۔سخت برہمی سے کہا۔تم میں سفید ریش کون ہے،اور سیاہ ریش کون ہے؟

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ان دونوں کی طرف عدالت میں موجود سب لوگوں نے دیکھا۔

''جناب،اس مقدمے سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟کوئی سفیدِ ریش ہو،یا سیاہ ریش؟''

دونوں بہ یک وقت گویا ہوئے۔

''تعلق ہے۔ایک شخص،دوسرے شخص کے خلاف مقدمہ پیش کرسکتا ہے۔ایک شخص خود کے خلاف مقدمہ کیسے پیش کرسکتا ہے''؟ منصف نے کہا۔

جناب،ہم پڑوسی ہیں،اور ایک دوسرے سے ہمارے تعلقات سخت کشیدہ ہیں۔دونوں بہ یک وقت گویا ہوئے۔

منصف سخت الجھ گیا تھا۔اس نے عدالت برخاست کی۔ایک ماہ بعد پیشی رکھی۔عدالت نے حکم دیا کہ اگلی پیشی پر مدعی اور مدعا الیہ اپنے وکیلوں کے ساتھ پیش ہوں۔

ایک ماہ بعد پھر وہی مقدمہ زیر بحث تھا۔سب نے دیکھا کہ دونوں کی ڈاڑھیاں سفید تھیں، مگر وکیلوں میں سے ایک کی ڈاڑھی سفید،اور ایک کی سیاہ تھی۔دونوں کے وکیلوں نے اپنے اپنے موکل کے حق میں وہی دلائل دیے،جو موکل خود ہی پہلے ہی دے چکے تھے۔منصف کی پریشانی دیدنی تھی۔کون

Scanned with CamScanner

،کس کا وکیل ہے؟ کون کسے بچانا چاہتا ہے، اور کس سے بچانا چاہتا ہے؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے تم ایک جنگل میں ہو، اچانک ایک درندہ تم پر حملہ آور ہو، تم اپنی تلوار نکالو، اس پر تانو، پوری طاقت سے اس کی گردن پر وار کرو، مگر گردن تک تلوار کی دھار پہنچنے سے پہلے.....تم دیکھو کہ تلوار غائب، تمھارے ہاتھ غائب۔ تم ہو، مگر نہیں بھی ہو۔ ایک درندے کے آگے، ایک اور درندہ۔ دونوں ایک جیسے۔ دونوں کی صورتِ حال ایک جیسی۔ کون کسے مارنا چاہتا ہے، کون کس کو مار سکتا ہے؟ ایک جیسی صورتِ حال میں ،ایک جیسے دو، کیوں کر ایک دوسرے کو مار سکتے ہیں؟

عدالت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اس مرتبہ نئی پیشی کی تاریخ چھ ماہ بعد رکھی گئی۔

چھ ماہ بعد۔

عدالت میں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے کہ اس مقدمے کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ عدالت میں موکل اور وکیل پہنچے، کچھ دیر بعد منصف تشریف لائے۔ عدالت میں موجود سب لوگ ایک ہی پل میں اس پریشانی کا شکار ہوئے، جس میں گزشتہ پیشی کے وقت منصف گرفتار تھا، مگر جسے یہ لوگ نہیں بھانپ سکے تھے۔ ان کی نظر پہلے وکیلوں پر پڑی۔ انھوں نے دیکھا، دونوں کی ڈاڑھیاں سفید اور شکلیں ایک جیسی ہو چکی ہیں۔ انھوں نے وکیلوں کو ان کے لباس سے پہچانا۔ پھر یک بیک ان کی نگاہیں منصف کی طرف اٹھی تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ منصف کی ڈاڑھی بھی سفید ہے، اور اس کی شکل ،پہلے دو کی مانند ہو چکی ہے۔ کچھ دیر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب نے دیکھا کہ کٹہرے، کٹہرے کے پاس، کرسی پر، سب جگہ ایک ہی چہرہ ہے۔ وہ ملتے جلتے، یا ایک جیسے آدمیوں کا کچھ نہ کچھ تصور رکھتے تھے، مگر ایک چہرہ ان کے سامنے، اتنی جگہوں پر، اور اتنی مختلف جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتا ہے۔ وہ پہلی مرتبہ بے طرح گڑ برائے۔ ان کی کھوپڑیوں میں دراڑ پڑنے لگی۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے سب ایک جنگل میں ہیں۔ اچانک وہ دیکھتے ہیں کہ ہرے پتوں میں سے ہرے رنگ کی، پتوں سے ملتی جلتی کوئی مخلوق ہے کہ جنگل میں پھیلتی جاتی ہے۔

اچانک ایک قدیمی جذبہ ان سب پر غالب آیا۔ وہ اٹھے، دروازے کی طرف بھاگے۔ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ کچھ گرے، کچھ کچلے گئے، کچھ نے چیخ پکار کی، کچھ کو اس کی بھی مہلت نہ ملی۔ کچھ کو

Scanned with CamScanner

البتہ یہ مہلت ملی کہ دوسروں کی صورتیں دیکھ سکیں۔ انھوں نے دیکھا کہ جو ہانپتے کانپتے بھاگ رہے تھے، صرف ان کی صورتیں مختلف تھیں، اور کچھ کچھ پہچانی جاتی تھیں!

◎ ◎
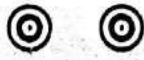
کھنڈر کی تختی

اس کھنڈر سے وقتاً فوقتاً کئی چیزیں برآمد ہوتی رہتی تھیں۔ ہڈیاں، سکے، ظروف، تختیاں، ہتھیار اور مورتیاں۔ ان سب کو عجائب گھر بھجوا دیا جاتا۔ کچھ کو دساور بھی چوری چھپے بیچ دیا جاتا اور کچھ کو نئے دولتیے بھاری رقم کے عوض خرید لیتے۔ جب کوئی نئی چیز برآمد ہوتی، اور وہ چوری چھپے بیچنے سے بچ رہتی تو اس کی خبر اخبار میں چھپ جاتی۔ رفتہ رفتہ عجائب گھر میں ایک پورا بڑا کمرہ اس کھنڈر کی نایاب اشیا سے بھر گیا۔ عجائب گھر کی انتظامیہ نے نوٹ کیا کہ گزشتہ چند سالوں میں سب سے زیادہ سیاح اسی کمرے کو دیکھنے آتے ہیں۔ باقی حصوں کو سرسری دیکھتے ہیں، مگر اسے زیادہ دل چسپی اور حیرت سے دیکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ چھ ماہ گزر گئے، کوئی نئی چیز اس کولیکشن میں شامل نہ ہوئی تو عجائب گھر کی انتظامیہ نے آمدنی میں خاصی کمی محسوس کی۔ اگلے ہفتے اخبارات میں ایک بڑی خبر شایع ہوئی۔ اسی کھنڈر سے ایک تختی برآمد ہوئی ہے، جس پر لکھی گئی عبارت کا کچھ حصہ پڑھ لیا گیا ہے، اور اس کا ترجمہ تختی کے نیچے درج کر دیا گیا ہے۔ یہ واقعی ایک بڑی خبر تھی۔ یہ پہلی تختی تھی، جس کی عبارت کو پڑھنے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ اگلے چند دنوں میں عجائب گھر کی ہزاروں ٹکٹیں فروخت ہوئیں۔ کچھ مہینوں بعد اخبارات میں یہ خبر شایع ہوئی کہ عبارت کی چند سطریں اور پڑھ لی گئی ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ اب لوگوں کو عجائب گھر کی اشیا سے زیادہ اس عبارت سے دل چسپی پیدا ہو گئی ہے۔ عجائب گھر میں آنے والوں کی بڑی تعداد اس چبوترے کے گرد اکٹھی ہوتی ہے جہاں وہ تختی رکھی گئی ہے۔ کبھی کبھی دھکم پیل بھی دیکھی جاتی، اور عجائب گھر کے گارڈ کو بلانا پڑتا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ تختی ٹوٹ نہ جائے۔

اس تختی کی پوری عبارت کو پڑھنے میں ماہرین کو تقریباً پانچ سال لگے۔ ان پانچ سالوں میں عجائب گھر کی آمدنی اس قدر بڑھی کہ ملک کے دوسرے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں قائم کی

Scanned with CamScanner

گئیں، اور وہاں اس کھنڈر کی اشیا کے حقیقی نظر آنے والے ریپلیکا رکھے گئے۔ ان شاخوں میں اس تختی کی نقل مطابق اصل رکھی گئی، اور جیسے جیسے اس کی عبارت کو پڑھا جاتا رہا، وہاں بھی درج کیا جاتا رہا۔

جن اخبارات میں اس کھنڈر کی اشیا سے متعلق خبریں شایع ہوتی تھیں، انھی میں سے کچھ بالکل نئی خبریں بھی شایع ہونے لگیں۔ یہ خبریں ان بحثوں کا نتیجہ تھیں، جو اس تختی کی عبارت کے بارے میں لوگوں کے مابین ہوتی تھیں۔ شروع شروع میں صرف لفظی جھگڑے ہوا کرتے تھے، بعد میں ہاتھا پائی کی خبریں آنے لگیں۔ پھر قتل و غارت کی۔

اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ سچ ہو رہا ہے۔ اس تختی کی پانچویں سطر میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا، جب لوگ روٹی، عورت، روپے کی خاطر نہیں، اپنی بات منوانے کی خاطر قتل کیا کریں گے، اور بات منوانے والوں کے کئی فرقے بن جائیں گے۔ آج یہ سچ ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری دریافت کردہ تختی کی سچائی کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟ عجائب گھر کے کیوریٹر نے اخبارات کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کی لوحِ مقدس کو پڑھنے والے کون لوگ ہیں، ان کا اتا پتا؟ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

وہ آثاریات اور لسانیات کے ماہرین ہیں، جن کے نام ایک خاص حکمت سے صیغہ راز میں رکھے گئے ہیں۔ کیوریٹر نے جواب دیا۔

کیا ہم اس حکمت کے بارے میں جان سکتے ہیں؟ دوسرے رپورٹر نے سوال داغا۔

اگر آپ کو دعویٰ ہے کہ ہم عبارت کا غلط مفہوم بتا رہے ہیں تو آپ خود اس عبارت کو پڑھ لیں۔ کیوریٹر نے جواب دیا۔

اس وضاحت کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔

اس تختی کے عجائب گھر میں آنے سے آپ کا بزنس اور جھگڑے ایک ساتھ بڑھے ہیں۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟ ایک اور اخبار کے رپورٹر نے پوچھا۔

تھینک یو ویری مچ۔ یہ کہہ کر کیوریٹر نے بریفنگ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

Scanned with CamScanner

پانچ سال بعد۔

انھی اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ اس کھنڈر سے جو تختیاں برآمد ہوئی تھیں، ان پر سرے سے کچھ لکھا ہوا ہی نہیں تھا۔ جس تختی کی عبارت نے پانچ سال تک ایک ہیجان برپا کیے رکھا، وہ کسی اور کھنڈر سے لائی گئی تھی!

◎ ◎

شر پسند

شہر میں لوگوں کی اموات بڑھتی جا رہی تھیں۔ حاکم شہر کو ان اموات سے پریشانی نہیں تھی۔ اسے اپنے ایک مشیر کی اس بات سے اطمینان رہتا کہ جو دنیا میں آیا ہے، اس نے دنیا سے جانا ہی ہے، وہ آج جائے یا کل۔ جنگ میں مرے یا کسی بیماری سے، حادثے میں جاں بحق ہو یا بڑھاپے کی نذر ہو یا اس کی حکم عدولی کے نتیجے میں جان سے جائے، کیا فرق پڑتا ہے۔ حاکم شہر نے کچھ دنوں سے ایک تبدیلی محسوس کی، جس سے اس کے اطمینان میں خلل پڑا۔ پہلے لوگ مرتے تھے تو لوگ دو چار دن سوگ مناتے اور پھر معمول کی زندگی شروع کر دیتے تھے، مگر اب وہ سوگ کم مناتے تھے، اور باتیں زیادہ کرتے تھے۔ کچھ باتیں بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ ان میں ایک بات یہ تھی کہ جنگ، حادثے، بیماری اور بادشاہ کے حکم سے لوگوں کے مرنے سے فرق پڑتا ہے، مرنے والے کو بھی اور مرنے والے کے لواحقین کو بھی۔ بادشاہ نے یہ بھی سنا کہ لوگ کہہ رہے تھے کہ بادشاہ کے قلم کی سیاہی، تقدیر کے قلم کی سیاہی سے مختلف ہے۔ یہ سن کر وہ آگ بگولہ ہوا، اور اس نے سب سے پہلے اس شخص کی موت کے پروانے پر دستخط کیے، جس نے بادشاہ تک یہ بات پہنچائی تھی۔ غصے میں بادشاہ کو یاد ہی نہیں رہا کہ جس شخص نے یہ بات بادشاہ تک پہنچائی تھی، وہ اس کا مشیر اور ہونے والا داماد تھا۔ جوں ہی اس کی موت کے حکم کی خبر ملکہ تک پہنچی، اس نے بیٹی کے سر کے ہونے والے سائیں کی زندگی کی فریاد کی، اور بادشاہ کو اپنا حکم بدلنا پڑا۔ بادشاہ پہلی مرتبہ تھوڑا سا ڈرا، اور اس نے لوگوں کی موت کے پروانوں پر دست خط

Scanned with CamScanner

سے پہلے کچھ غیبی اشارے سمجھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سونے کا ایک سکہ لیا، اس کے ایک طرف اپنی مہر کھدوائی، اور دوسری طرف فرشتہ غیبی کی تصویر۔ موت کا فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سکہ اچھالتا۔ اگر فرشتہ غیبی کی تصویر والا رخ سامنے آتا تو موت کے حکم نامے پر دستخط کر دیتا، ورنہ اپنا فیصلہ مؤخر کر دیتا۔ اگلے دن پھر یہی عمل دہراتا۔ اگلے چند دنوں میں واقعی فرشتہ غیبی کی تصویر والا رخ سامنے آجاتا۔ بادشاہ خوش تھا کہ وہ تقدیر کے فیصلے کا انتظار اور پابندی کرتا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ لوگوں کی زبانیں اور چلنے لگی تھیں۔ جیسے جیسے اموات بڑھتی جا رہی تھیں، لوگوں کی باتوں میں پہلے دبی دبی شکایت ظاہر ہوئی، پھر ہلکا ہلکا طنز اور غصہ، بعد میں کچھ کچھ احتجاج، اور کچھ عرصہ بعد لوگ بغاوت کرتے ہوئے سڑکوں پر نکلنے لگے۔

بادشاہ نے اپنے خاص مشیروں وزیروں کی مجلس بلائی۔ سب سے مشورہ مانگا کہ لوگوں کے احتجاج کو کیسے روکا جائے۔

لوگوں کے اکٹھے ہونے پر پابندی عائد کی جائے۔ جو خلاف ورزی کریں انھیں گولیوں سے بھون ڈالا جائے۔ ایک مشیر نے رائے دی۔

جاسوسوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ بہتر ہوگا ہر آدمی کو دوسرے آدمی کا جاسوس بنا دیا جائے۔ سب ایک دوسرے سے ڈرنے لگیں گے۔ دوسرا مشیر بولا۔

کچھ خاص لفظ چن لیے جائیں، جیسے حق، ذمہ داری، اختیار، مانگنا، چھیننا، بغاوت، احتجاج جوں ہی کسی شخص کی زبان سے نکلیں، اسے تختہ دار پر شہر کے عین چوک میں کھینچا جائے۔ تیسرے مشیر نے تائید کی۔

بادشاہ کو آخری تجویز آدھی پسند آئی۔ باتوں کا جواب باتوں ہی سے دینا عقل مندی ہے۔ یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے کچھ دیر توقف کیا، اور پھر مجلس کے خاتمے کا اعلان کیا۔

پانچ دنوں بعد شہر میں اپنی طرز کا انوکھا واقعہ ہوا۔ شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ میں بادشاہ کی سپاہ کے لوگوں نے گھس کر درجنوں لوگوں کو عین اس وقت تہ تیغ کیا، جب وہ عبادت میں مصروف تھے۔ جوں ہی یہ واقعہ ہوا، اس کے فوراً بعد بادشاہ کے حکم سے شہر کے ہر چوک چوراہے میں نوبت بجنے

Scanned with CamScanner

لگی، اور بادشاہ کی طرف سے یہ اعلان کیا جانے لگا کہ شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ میں دشمن ملک کے شر پسند گھس آئے تھے، جن کا صفایا کر دیا گیا ہے، اور شہر کو ایک بڑی ممکنہ تباہی سے بچالیا گیا۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ شر پسند اگر عبادت گاہوں، گھروں یہاں تک کہ غاروں میں بھی چھپے ہوں گے تو ان کا خاتمہ کیا جائے گا۔

یہ سنتے ہی پورا شہر بادشاہ کے محل کی طرف اُمڈ پڑا۔ تھوڑی دیر بعد دوراندیش اور رعایا پرور بادشاہ کے حق میں نعرے گونج رہے تھے۔

اس کے بعد شہر میں لوگوں کی اموات پہلے سے بھی بڑھیں، مگر رعایا کی طرف سے کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس سے بادشاہ کے اطمینان میں خلل ہوتا!!

◎ ◎

''شکم کی بھوک سیر ہو جاتی ہے، زبان کی نہیں''

کچھ دنوں سے شہر کی مرکزی شاہراہ کے دونوں طرف احتجاجی جلوس نکلنے لگے تھے۔ ایک طرف خوش پوش مرد و خواتین ہاتھوں میں پلے کارڈ اٹھائے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے، نسبتاً دھیمی آواز میں نعرے لگاتے نظر آتے۔ شاہراہ کے دوسری طرف میلے، پھٹے، آدھے کپڑے پہنے لوگ اونچی آواز میں حکومت کے خلاف نعرے لگاتے۔ ایک طرف کے لوگوں کا مطالبہ تھا کہ انھیں کہنے کی آزادی دی جائے۔ ان کے پلے کارڈوں پر کچھ تصویریں بنی تھیں، اور کچھ عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر میں ایک بچہ دکھایا گیا تھا، جس کی زبان کاٹ دی گئی تھی۔ ایک اور تصویر میں ایک نوجوان جوڑا دکھایا گیا تھا، جن کے ہونٹوں پر تالے لگے تھے، وہ اپنے ہونٹوں کو بولنے کے لیے کھول رہے تھے، ان کے ہونٹ چر گئے تھے، مگر ساتھ تالے بھی ٹوٹتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ ایک پلے کارڈ پر لکھا تھا: بولنے کی آزادی آدمی ہونے کی پہلی شرط ہے۔ دوسرے پلے کارڈ پر درج تھا: زباں کو بند کرنے والو، ذہن کو بند کیسے کرو گے؟ دوسری طرف کے نوجوان اور بوڑھے مردوں، اور بچوں نے اپنی قمیصیں اتار کر گلے میں خشک روٹیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ وہ سینے پر دوہتڑ مارتے، حکومت کو مہنگائی کی دہائی دیتے۔ کبھی تپتی سڑک پر

Scanned with CamScanner

لیٹ کر سینہ کوبی کرتے اور کبھی ایک دائرہ سا بنا کر کھڑے ہوجاتے اور گلے میں لٹکائی گئی روٹیوں کو ہاتھوں میں پکڑ کر آسمان کی طرف رخ کرتے اور دلسوزی سے بین کرتے۔ان کے ہاتھوں میں کوئی پلے کارڈ نہیں تھا۔

دونوں طرف کے احتجاجی ایک دوسرے کی مخالف اطراف سے سڑک پر آتے۔درمیان میں ایک مقام ایسا آتا جہاں دونوں گروہ ایک دوسرے سے اسی طرح ملتے جس طرح دو سمندر آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کے بیچ ایک لکیر واضح نظر آتی ہے۔کچھ احتجاجی ایک دوسرے کو دیکھتے، پھر کچھ سوچتے ہوئے منھ دوسری طرف پھیر لیتے۔

حکومت نے کئی ہفتوں تک احتجاج پر دھیان نہیں دیا۔دونوں طرف کے احتجاجی اس انتظار میں تھے کہ کب حکومتی نمائندے ان کی طرف آئیں ،اور ان کے مطالبات سنیں۔جب انتظار طویل ہوا تو دونوں طرف کے لوگوں پر پہلے تھکن طاری ہوئی، پھر بے زاری جس کے نتیجے میں وہ تشدد کی طرف مائل ہوئے۔شاہراہ کے آس پاس کچھ سرکاری عمارات تھیں، ان میں توڑ پھوڑ کی،اور کچھ پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں کے شیشے توڑے تو پولیس نے دونوں طرف کے احتجاجیوں کے لیڈر گرفتار کر لیے۔

اگلے دن دونوں طرف کے احتجاجی اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ دونوں میں سے کس کا مطالبہ بنیادی ہے۔آزادی اظہار والوں کی رائے تھی کہ بولنے کی آزادی ہوگی تو روٹی کا مطالبہ کیا جاسکے گا، جب کہ بھوکوں کا خیال تھا کہ بولنے سے پہلے بولنے کے لیے طاقت چاہیے جو روٹی کھانے ہی سے ملتی ہے۔دونوں میں سے کوئی بھی اپنے مئوقف سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔دونوں طرف کے لیڈر، جو گرفتاری کے بعد رہا ہو کر آئے تھے،اس بات پر ڈٹے ہوئے تھے کہ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے سڑکوں پر ہیں۔'عظیم مقصد' کے یقین نے دونوں کو بہادر، نڈر اور بڑی حد تک ہٹ دھرم،اور کافی حد تک ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا تھا۔وہ کٹنے مرنے،اور کاٹنے مارنے کے لیے بھی تیار تھے۔اب انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگانے شروع کیے۔ایک دوسرے کو حکومت کے ٹٹو ہونے کے طعنے دیے۔اس پر دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی،اور کچھ سر پھٹول بھی۔ایک مرتبہ پھر دونوں طرف کے

Scanned with CamScanner

لیڈر گرفتار ہوئے۔

دو دن بعد حکومت نے بھوکے لوگوں کا مطالبہ مان لیا، اور سستی روٹی مہیا کر دی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ چوں کہ عوام وخواص یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ ان کا بنیادی مطالبہ کیا ہے، اس لیے وہ مفاد عامہ میں فیصلہ کرتی ہے کہ بھوک ہی بنیادی مطالبہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے گندم کے لیے بھاری سبسڈی جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ بھوکے احتجاجیوں نے اس پر جشن منایا، مگر دوسری طرف کے احتجاجیوں نے حکومت کے اس اعلان پر سخت احتجاج کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت یہ فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں کہ لوگوں کا بنیادی مطالبہ کیا ہے۔ نیز حکومت نے دو میں سے ایک گروہ کا مطالبہ مان کر ان سے امتیازی سلوک کیا ہے، جسے کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی اظہار والوں کے اس ردِّعمل پر بھوکے لوگ سیخ پا ہوئے، انھوں نے چیخ چیخ کر کہا کہ ان سب کے شکم بھرے ہوئے ہیں، اس لیے وہ خالی آنتوں کا کرب سمجھنے کے قابل ہی نہیں، بے حس بھی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بھوکوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بھوک مٹانے کے ہرگز خلاف نہیں، انھیں صرف حکومت کے اس اختیار سے سخت اختلاف ہے کہ وہ انسانوں کے بنیادی حق کا فیصلہ کرے۔ ان کے نزدیک یہ فیصلہ، بنیادی حق میں مداخلت ہے لیکن ان کی دلیل نہیں سنی گئی، اور انھیں بھوکوں نے اپنا دشمن سمجھا، اور حکومت نے دشمن کا ایجنٹ قرار دیا۔

ایک ہفتے بعد بھوکوں نے آزادی اظہار والوں کے خلاف باقاعدہ ایک جلسہ کیا، جس میں تقریریں کی گئیں، جن کا لب لباب یہ تھا کہ آدمی کا اصل مسئلہ بھوک ہے۔ اظہار کی آزادی بھرے پیٹ کے لوگوں کی ہوس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ لوگ پہلے حکومت پر لعن طعن کرنے کی آزادی مانگتے ہیں، جب نہیں ملتی تو مزید آزادیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ جنس کی آزادی چاہتے ہیں، نیز مذہب، اخلاق، روایات اور بڑی شخصیات پر تنقید کی آزادی چاہتے ہیں۔ بھوکوں نے اپنی تقریروں میں یہ بھی کہا کہ شکم کی بھوک سیر ہو جاتی ہے، مگر زبان کی بھوک نہیں۔ انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ وہ اس قسم کی آزادی مانگنے والوں کے خلاف حکومت کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ اسی جلسے میں ایک حکومتی وزیر نے گندم کے ساتھ ساتھ چاول، چینی اور گھی کے لیے بھی سبسڈی کا اعلان یہ کہہ کر کیا کہ اگرچہ حکومت کے

Scanned with CamScanner

خزانے پر غیر معمولی بوجھ پڑے گا، مگر وہ اپنے عوام کی خاطر یہ بوجھ بخوشی برداشت کرے گی۔

آزادی اظہار والے بدستور سڑک پر تھے، اور حکومت ان کے احتجاج سے لاتعلق تھی، لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ حکومت کے کان کھڑے ہوئے۔ آزادی اظہار والوں کے احتجاج میں وہ لوگ بھی شریک نظر آئے جو پہلے بھوکوں کے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پوسٹر تھا، جس پر ایک نوجوان کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے، زبان کی شکل روٹی کی مانند ہے، جس میں چھید کر کے تالا لگا ہوا ہے۔

اگلے ہی دن حکومت نے کھانے کی اشیا پر تمام سبسڈی واپس لے لی۔

◎ ◎

تیسرا دروازہ

یہ دروازہ جنت کا ہے، اور وہ جہنم کا، تم کس سے گزرنا پسند کرو گے؟ اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں تیسرے دروازے سے گزرنا چاہوں گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

تیسرا دروازہ؟ یہاں تو کوئی تیسرا دروازہ نہیں ہے۔ وہ حیران تھا۔

اسی لیے تو اس سے گزرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

مجھے آپ کی بات پلے نہیں پڑی۔ وہ منمنایا۔

میں باب بہشت ہی پار کر کے ہی یہاں، میرا مطلب ہے... تمھاری بستی میں آیا ہوں۔ اسی لیے اب تیسرے دروازے سے گزرنا چاہتا ہوں۔ میں نے وضاحت کی۔

تم باب بہشت سے گزر چکے ہو؟ لیکن .... تم تو اس بستی میں پہلی مرتبہ آئے ہو۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں جہاں سے آیا ہوں، وہاں بھی بابِ بہشت ہے، بلکہ ہر بستی میں اس طرح کا دروازہ ہے۔لوگ اس سے گزرتے ہیں،مگر جانتے نہیں۔میں نے اِسے سمجھانے کی کوشش کی۔

بھائی صاحب پہیلیاں مت بجھوائیں۔اس کے لہجے میں درخواست تھی۔

اچھا یہ بتاؤ،تم کس دروازے سے گزرے ہو؟ میں نے اس کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک بار جنت کے دروازے سے گزرنے کی جاں توڑ کوشش کی تھی،مگر وہ دھکم پیل تھی کہ پسلی تڑوا کر واپس آ گیا۔یہاں جس کو دیکھو،اسی ایک دروازے سے گزرنا چاہتا ہے۔

جانتے ہو، کیوں؟

نہیں۔

اس لیے کہ یہ سب جنت حاصل کرنا نہیں چاہتے،مقابلہ جیتنا چاہتے ہیں۔دھکم پیل مقابلے کے سوا کہاں ہوتی ہے؟ خیر،کیا تم نے کسی کو جہنم کے دروازے سے گزرتے دیکھا ہے؟

نہیں۔

تم نے دیکھا ہوگا،مگر تمھیں یاد نہیں۔جس نے تمھاری پسلی توڑی تھی، وہی تو تھا۔جہنم کے دروازے کا ایک پٹ یہاں سے گزرنے والے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔میں نے جنت کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تم جس تیسرے دروازے کی بات کرر ہے تھے،وہ کب کھلے گا اور کہاں؟ اس نے سوال دہرایا۔

جب یہ دونوں دروازے بند ہو جائیں گے تو تیسرا دروازہ کھلے گا۔

یہ بند کیسے ہوں گے؟اس نے ایک نیا سوال کیا۔

جب تک تیسرا دروازہ نہیں کھلتا، یہ بند نہیں ہوں گے۔اس کے نہ کھلنے ہی سے ان دونوں دروازوں میں یہ سب رونق یعنی دھکم پیل ہے۔میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

وہ کب اور کہاں کھلے گا؟

یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، مگر ان دروازوں کے ساتھ اور ان کی جگہ نہیں۔ میں نے پہلے آسمان کی طرف دیکھا، جو صاف اور چمکیلا تھا، پھر اپنے گریبان میں جھانکا، اور کہا۔

میں تب تک انتظار کروں گا۔ اس نے باب بہشت کی طرف بے نیازی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں بھی!

Scanned with CamScanner

''ہم سب ایک کنویں سے پانی بھرتے تھے۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کنواں خشک ہوسکتا ہے... نہیں وہ کنواں خشک نہیں ہوا، وہ اچانک غائب ہوگیا.... ہمیں ریت کر گیا... کون اس کا جواب دے گا؟ ہمارے پرکھوں نے زمانوں سے کنویں کا پانی پیا.... پھر ہم ریت کیسے ہوگئے.... ہماری رگوں میں کنویں کے پانی کے علاوہ بھی کوئی شے شامل تھی..... یا کنویں کا پانی.... ہم میں سے کوئی ہوگا، جس نے کنویں میں اپنا پانی شامل کر دیا ہوگا..... کتاب میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا، لوگ کہیں گے، ان کے ذہنوں میں بھی وہی لفظ اترتے ہیں جو کتاب میں ہیں.... وہ کتاب میں اپنے لفظ شامل کریں گے، اور کنویں کا پانی زہر بن جائے گا...... ورنہ ہم ریت کیوں ہوتے .... یہ اچانک ہم سب کے پاس اتنے سارے کٹورے کہاں سے آگئے .... ہم سب کی کھوپڑیاں کٹوروں میں کیسے بدل گئیں.... کنواں نہیں رہا.... ہم ریت سہی، پر ہیں........ سب کے پاس اپنا اپنا کٹورا ہے... پر، اپنے اپنے پانی سے سب کٹورا کیسے بھریں گے؟.... سب کے پاس اتنا پانی کہاں ہے؟ سب کے پاس اپنا پانی ہوتا ہی کہاں ہے؟..... سارے جھگڑے ہی اپنے اپنے پانی کے ہیں.... تمھیں یاد ہوگا... کتاب میں لکھا تھا۔ جس گھر میں ہر ایک کے پاس چھڑی ہوگی، وہ ایک دوسرے کا سر پھاڑیں گے۔ کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ جس گھر میں زیادہ چھڑیاں ہوں گی وہاں سانپ بھی زیادہ آئیں گے، اور جہاں سانپ زیادہ ہوں گے، وہاں ہر ایک کی زبان پر زہر ہوگا... ہم اپنے کٹوروں کو تب تک خالی رکھیں گے، جب تک ان کٹوروں کا اپنا پانی نہیں پیدا ہو جاتا..... کٹورے پانی پیدا کر سکتے ہیں..... وہ پانی ضرور اس پانی سے جدا ہوگا جسے ہم اب تک ان میں بھرتے چلے آئے ہیں''۔

''میں اپنے تجربے سے کہہ سکتی ہوں کہ آدمی نے اصل لذت پر دماغ کی لذت کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اور ان کا دماغ ہماری قطار کی مانند ہے۔ چلتا ہی رہتا ہے۔ تم دیکھنا، ابھی انھوں نے سور کا چہرہ پہنا ہے، کچھ دیر میں یہ بھیڑیے بنیں گے، پھر خوں خوار کتوں کی مانند ایک دوسرے پر غرائیں گے، پھر بدمست ہاتھی بن جائیں گے، پھر سوروں کی طرح اپنی اور دوسروں کی عورتوں کو بھنبھوڑ ڈالیں گے، پھر بے سدھ ہو کر گدھے کی طرح خراٹے لیں گے، اور پھر اگلے دن پارسا نظر آئیں گے۔ افسوس سوروں کا ہے، جو نہ پورے آدمی بن سکیں گے، نہ پورے سور باقی رہیں گے''۔

(کتاب میں شامل کہانیوں سے مقتبس)

سرورق: قدوس مرزا

Rs. 700.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3091-8
ISBN-13: 978-969-35-3091-9